

کتاب

ہمیشہ یاد رکھئے

کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینہ کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینہ کے اخیر تک پانچ پیسہ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
 منیجر "نگار"

نگار

تصانیف نیاز پوری

نگار

نگارستان	جمالستان	مکتوبات نیاز	شہباز کی سرگزشت
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ قیمت دو روپیہ (عار) علاوہ محصول	ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دورہ مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۳۳ نکتہ کوچ ہیں۔ زبان قدرت بیان علی تخیل اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (لعلہ) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم	ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور البیلین کے لفظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی پھیلے معلوم ہوتے ہیں وہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (پچا) علاوہ محصول	شہباز کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلند ری مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عار) علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد و عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جس میں سات مضامین ادبی نگار کے لکھے ہوئے ہیں
 حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عار علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندی شاعروں کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت عار علاوہ محصول

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ "نگار" کا جنوری شمارہ
بہ وجہ اضافہ ضخامت و قیمت

میں
رہنما
یہ

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچتا ہے اگر حاسبین کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے
مگر پندرہ روپہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے)
اور اس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
مینجر "نگار"

جلد (۲۸)	فہرست مضامین جولائی ۱۹۴۰ء	شمار (۱)
----------	---------------------------	----------

۲	ملاحظات	
۹	عربوں کی سیاسی بیداری	محمد عتیق صدیقی
۱۹	مکتوبات نیاز پر اظہار خیال	رشید احمد صدیقی ایم۔ اے۔
۲۹	روسی نظام حکومت پر ایک تاریخی و اقتصادی تبصرہ	
۳۶	مشین کا اثر ہماری معاشرت پر	سید دہاج الدین احمد بی۔ اے۔ (علیگ)
۴۴	تیاگ	شبلی ابراہیمی
۴۹	مرزا ابوالحسن آصف خاں	کوثر چاند پوری
۵۹	کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟	
۶۶	بعض حیرتناک سیاسی اکتشافات	
۷۳	مکتوبات نیاز	
۷۵	باب الاستفسار	
۷۶	تنوعات	
۷۷	منظومات	فانی، اثر، تمکین

نگار

اڈیسٹر: نیاز فتحپوری

شمار - ۱

جولائی ۱۹۴۰ء

جلد - ۳۸

ملاحظات

رفتار جنگ

دنیا کی تاریخ میں فتح و شکست کی شاید ہی کوئی ایسی عجیب و غریب مثال آپ کو نظر آئے جیسی اس وقت فرانس کے میدان جنگ میں نظر آئی ہے

فرانس ایسی عظیم الشان سلطنت، جو تمام نوآبادیوں کو ملا کر گیارہ کروڑ انسانوں پر حکمراں تھی، جس کی ۵۵ لاکھ فوج دنیا کی بہترین آراستہ فوج سمجھی جاتی تھی، جو دنیا کی بڑی بڑی بحری قوتوں میں چوتھے نمبر پر شمار ہوتی تھی، جس کی زمین سالانہ ۴۸ ملین ٹن کوئلہ، ۳۸ ملین ٹن لوہا اور ۸ ملین ٹن فولاد کی دولت اگلتی رہتی تھی اور جس کے پاس ۴۰ کروڑ پونڈ کا سونا محفوظ تھا ایسی زبردست حکومت کا صرف دو ہفتہ کے اندر جرمن افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دینا اور باوجود برطانیہ کی حمایت و تقویت کے، نازی حکومت کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کر لینا، تاریخ عالم کا اس قدر عجیب و غریب واقعہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری مثال اس کی مل سکے

یقیناً جرمن فوجوں کی تعداد زیادہ تھی، ان کے اسلحہ بھی بہتر تھے، ان کا طریق جنگ بھی نیا تھا، تاہم فرانس کا اس بڑی طرح ہمت ہار دینا کہ وہ پولینڈ کے برابر بھی حملہ نہ جھیل سکے اور دس بارہ دن کے اندر ہی اندر صدیوں کی بنی بنائی

شوکت و جبروت خاک میں مل جائے، کوئی خاص معنی رکھتا ہے اور بلاشبہ اس کا تعلق کسی ایسے راز سے ہے جس کا صحیح حال دنیا کو غالباً اختتام جنگ ہی کے بعد معلوم ہوگا۔

جس وقت نازی فوجوں نے اپنا رخ فلانڈرس کی طرف کیا تو جنرل ویگان نے اس کو اپنے لئے قابل نیک قرار دیا، کیونکہ اس طرح انھیں مہلت ملگئی تھی کہ وہ پیرس اور نازی افواج کے درمیان ایک زبردست خطِ ممانعت قائم کر کے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیں گے، لیکن جب جرمن فوجیں، فلانڈرس سے فارغ ہو کر فرانس کی طرف پیش تو جنرل ویگان اور ان کی فوجوں کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو گئی کہ ان کا کلا سکل طریق جنگ برمنی کے نئے اندازِ حرب کا حریف نہیں بن سکتا اور ابتدا ہی سے فرانسیسی فوجوں میں بددلی کے آثار پیدا ہو گئے چنانچہ جرمنی کے ہزاروں ٹینکوں نے بڑھنا شروع کیا اور فرانسیسی افواج نے ہٹنا، یہاں تک کہ اس آگ کے شعلے پیرس تک پہنچ گئے اور سارے ملک میں انقلاب کی ایک لہر دوڑ گئی جس نے ریاست کی وزارت سے جو جنگ کی حامی تھی استعفیٰ کا مطالبہ کیا اور اسکی جگہ جنرل پیٹیاں کی وزارت قائم ہوئی جو اس جنگ کو ختم کر دینے کا حامی تھا۔ فرانسیسی فوج کے انتشار اور ملک کی بددلی کا جو عالم تھا، اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت بورڈو کے ہوٹل میں رات کو جنرل پیٹیاں کی جدید کینٹ کا جلسہ ہوا تو ایک فرانسیسی سپاہی بھی پہرہ دینے کے لئے موجود نہ تھا۔

نازی فوجیں ترقی کر کے فرانسیسی افواج کو گرفتار کر رہی تھیں، خطِ میز تو جسے اس وقت تک ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا، بچوں کے سر پرندے کی طرح ٹوٹ رہا تھا، سولین آبادی انتہائی انتشار و اضطراب کے عالم میں کوہِ دھما کی خاک چھانتی پھر رہی تھی اور مطلق سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جرمنی کے اس سیلابِ آتش و آہن کو کیونکر روکا جائے۔ اب سے ساڑھے پچھلے بھی یوٹانک قوم کا شجرِ فرانس کے حلق تک پہنچا تھا، لیکن اس مرتبہ جس بے بسی اور بے کسی کا اظہار فرانس کی طرف سے ہوا وہ تاریخ کا بالکل پہلا واقعہ ہے۔

امداد کا وعدہ کرنے والوں کی طرف سے نازی دیر تا پیر جتنی قربانیاں چڑھائی جاسکتی تھیں، چڑھائی جا چکی تھیں اور فرانس کے لئے جو بدقسمتی سے برطانیہ کے ”ایفاءِ عہد“ تک زندہ نہ رہ سکا سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ اپنے آپ کو نازیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے، چنانچہ ٹھیک اسی جگہ اور قریب قریب اسی تاریخ کو جب ۱۹۴۰ء میں جرمن حکومت کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے تھے، اب فرانس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے اور دنیا حیرت سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔ جرمن و فرانس کے درمیان عارضی شرائطِ صلح کا اجمالی حال اخباروں کے ذریعہ سے سب کو معلوم ہو چکا ہے میں نے ”اجمال“ کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ جو صلح نامہ فلس کیپ سائیز کے تیس گنجان طائپ کئے ہوئے صفحات کو محیط ہو وہ یقیناً بہت سی ایسی تفصیلی باتوں کا بھی حامل ہوگا جن سے اس وقت تک دنیا کو بے خبر رکھا گیا ہے، لیکن جمہوری بیان شایع ہوا ہے وہ بھی اتنا سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ فرانس کی عظمت دیرینہ بالکل ختم ہو چکی اور باوجود

اس کے کہ جنرل پٹیاں کی وزارت اس صلیخا میں کوئی بات ایسی نہیں پاتی جو فرانس کی عزت کو صدمہ پہنچانے والی ہو، فرانسیسی قوم یقیناً ذلیل ہو چکی اور اس کی باعزت زندگی اب اس وقت تک واپس نہیں آ سکتی جب تک نازی حکومت کو شکست نصیب نہ ہو اور اس کے حلق سے تمام ان حکومتوں کو ایک ایک کر کے ڈاگلوایا جائے، جن کو وہ اس وقت تک ہضم کر چکا ہے

اس صلیخا کی رو سے، تمام شمالی و وسطی فرانس مع تمام مغربی سواحل کے جرمنی کے قبضہ میں رہے گا، فرانس کے بحری بیڑے کا بڑا حصہ جرمنی کی نگرانی میں چلا جائے گا اور تمام فوجی ادارے - حملہ ذخائر جنگ کے نازی حکومت کے حوالہ کر دیے جائیں گے اور اسی کے ساتھ فرانس کو ان نازی افواج کے مصارف بھی ادا کرنے پڑیں گے جو اختتام جنگ تک فرانس پر قابض رہیں گی

ان شرائط کے مطالعہ سے نازی حکومت کا اصل مقصد پوری طرح واضح ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فرانس کی طرف سے برطانیہ کی تمام امیدیں بالکل منقطع ہو جائیں اور بلجیم و فرانس کے مغربی سواحل پر قابض ہو کر وہ صلیج بسکے (Suez Canal) اور رودبار انگلستان کو برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کے لئے خطرناک بنا دے۔ اسی کے ساتھ آپ اگر ان شرائط کو بھی پیش نظر رکھیں جو آٹلی اور فرانس کے درمیان طے پائی ہیں تو اس خیال کو اور مزید تقویت پہنچتی ہے، کیونکہ ان شرائط کی رو سے فرانس کا اقتدار بحر روم اور سواحل افریقہ سے بھی ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا بحر شمال سے لیکر بحر روم تک سارے حصہ آپ کو برطانیہ کی بحری نقل و حرکت کے لئے خطرناک بنانے کی اسکیم ہٹلر کے پیش نظر ہے

گزشتہ جنگ کے بعد اس میں شک نہیں کہ بر اعظم یورپ میں فرانس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور مشرقی یورپ کی اتحادی پالیسی میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، لیکن افسوس ہے کہ یورپ کی بین الاقوامی سیاست اور مجلس اقوام کی کمزوری نے فرانس کی اس اہمیت کو رفتہ رفتہ کم کرنا شروع کیا اور جرمنی کو موقع دیا جاتا رہا کہ وہ معاہدہ ورسائی کی خلاف ورزی کر کے آہستہ آہستہ اپنی قوت کو بڑھاتا رہا۔ پھر فرانس اور برطانیہ یہ توجہ دے سمجھے تھے کہ ہر من قوم اپنے گزشتہ نقصانات کی تلافی اپنی صنعت و تجارت کے ذریعہ سے پوری طرح کر سکتی ہے، لیکن اس کی فوجی طیاروں کی طرف سے دونوں کی آنکھ بند تھی اور یہ بے خبری برابر قائم رہی یہاں تک کہ ایک ایک کر کے اس نے پولینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ و بلجیم پر قبضہ کر لیا اور جب آخر میں اس نے ۲۰ ہزار ٹینکوں اور بے شمار طیاروں سے فرانس پر حملہ کیا تو اقرار کرنا پڑا کہ جرمنی کی یہ کامیابیاں صرف اس کی زبردست فوجی طیاروں اور خوبی اسلحہ کی وجہ سے ہیں۔ لیکن اتحادیوں کو کس نے منع کیا تھا کہ وہ اس قسم کی طیاریاں نہ کریں اس کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک نے دوسرے کی قوت کا غلط

اندازہ لگایا تھا، نہ اتحادیوں کے وہم گمان میں یہ بات آسکتی تھی کہ نازی حکومت کی فوجی طیاریاں اس قدر زیر دست ہو سکتی ہیں اور نہ نازی حکومت اس سے واقف تھی کہ فرانس فوجی طیاریوں کے لحاظ سے اس قدر پیچھے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نازی حکومت کی گزشتہ سات سال کی تاریخ سوائے مکرو فریب اور جھوٹ کے کچھ نہیں لیکن اس جھوٹ کے انبار میں ایک بات سچ بھی تھی وہ یہ کہ اس کی فوجی طیاریاں غیر معمولی حد تک پہنچ گئی ہیں اور اسی ایک سچ کو جھوٹ سمجھنے کا خمیازہ اس وقت سارے یورپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اب جنگ جس نقطہ پر پہنچ گئی ہے اس نے بیشک ہمیں فیصلہ کن ساعت سے قریب تر کر دیا ہے لیکن سوال یہی ہے کہ وہ فیصلہ کیا ہوگا اور یہ دور آمریت ختم ہوگا یا نہیں۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں انگلستان کی طرف لگی ہوئی ہیں جو جمہوریت کی طرف سے اکھاڑہ میں تنہا مقابلہ کے لئے رہ گیا ہے اور اسی کی پوزیشن پر ہمیں غور کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فرانس کے ہمت ہار دینے سے برطانیہ کا ایک بازو ضعیف ہو گیا ہے، لیکن چونکہ انگلستان جزیرہ ہے اور جرمنی کو یہاں ٹینکوں سے حملہ کرنے کی وہ آسانیاں حاصل نہیں جو فرانس میں حاصل تھیں، اسلئے لامحالہ فیصلہ بحری جنگ پر آکر ٹھہرے گا جس میں برطانیہ کا تفوق ظاہر ہے۔

ہر چند عارضی شرائط صلح کی رو سے فرانسیسی بیڑے، جرمنی کی نگرانی میں چلے جاتے ہیں اور اس نگرانی کے معنی یہ ہیں کہ وہ عہد شکنی کر کے ان سے کام بھی لے سکتا ہے لیکن چونکہ فرانسیسی نوآبادیاں اس صلح کی طرفدار نہیں ہیں اور وہ فرانس کی آزادی کے لئے اب بھی لڑنے کے لئے طیاریں، چنانچہ شام کے فرانسیسی سپہ سالار، انڈو چائنا کے گورنر اور تیونس و مراکش وغیرہ کے حاکموں کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ مرکزی حکومت کے احکام کی تعمیل نہیں کریں گے، اس لئے ممکن ہے کہ فرانسیسی بیڑے کا بڑا حصہ جو بحر روم یا دوسرے سمندروں میں پایا جاتا ہے بدستور آزاد رہے اور برطانیہ کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لے۔ اگر یہ قیاس صحیح نکلا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جرمنی کبھی انگلستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہ کرے گا۔ بعض کا خیال ہے کہ اگر فرانسیسی بیڑے جرمنی کے قبضہ میں نہ آئے یا انھوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا، تو اٹلی اس کمی کو پورا کرے گا، لیکن یہ خیال درست نہیں اٹلی نے تو اپنے اندازہ کے مطابق اس وقت جنگ میں اپنی شرکت کا اعلان کیا تھا جب اس کے نزدیک میدان صاف ہو چکا تھا اور فرانس کی شکست کو اس نے لڑائی کا انجام سمجھ لیا تھا، لیکن فرانس کی شکست کے بعد بھی صورت وہی باقی رہتی ہے اور بحر روم میں وہ اپنی کمزوری کو پوری طرح محسوس کر چکا ہے، اس لئے اٹلی جرمنی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، بلکہ خیال یہ ہے کہ کہیں اس کا بوجھ خود جرمنی کے لئے ناقابل برداشت نہ ہو جائے، کیونکہ اب چاروں طرف سے اس کی ناکہ بندی ہو چکی ہے اور اس کے سوا حل اتنے کھلے ہوئے ہیں کہ وہ عرصہ تک مقابلہ کی تاب لا ہی نہیں سکتا۔ اس سلسلہ میں جرمنی کی ایک چال اور بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اپنی کمر بھڑکا کر

شرکت جنگ پر آمادہ کرے کیونکہ جنرل فرانکو کی حکومت ہٹلر اور مسوینی ہی کی مدد سے قائم ہوئی ہے، چنانچہ ہسپانیہ کی طرف سے مطالبہ جبرالٹر کی خبریں اس دوران میں ایک دو بار سننے میں آئی ہیں، لیکن چونکہ وہاں کی جمہوری جماعت میں بدستور بے صبری پائی جاتی ہے اس لئے اگر جنرل فرانکو نے جبرالٹر کے لئے جنگ چھیڑ دی تو یہ بات خلاف قیاس نہیں کہ وہاں پھر خانہ جنگی شروع ہو جائے اور فرانکو کی نئی قائم کی ہوئی حکومت جو ہنوز متزلزل حالت میں ہے ختم ہو جائے بہر حال اٹلی اور اسپین کی طرف سے نازی حکومت کو کوئی توقع نہیں ہے اور نہ ان کی امداد کے بھروسہ پر وہ انگلستان پر حملہ کر سکتا ہے

اس مسئلہ میں روس کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن اس کی پالیسی اس قدر مشتبہ ہے کہ نہ نازی حکومت اس پر بھروسہ کر سکتی ہے نہ برطانوی حکومت۔ عرصہ تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پہلے ہالٹک ریاستوں پر قبضہ کیا اور اب رومانیہ سے بسربیا اور بکووینا بھی لے لیا ہے۔ اس سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ اگر روس نے رومانیہ کی طرف پیش قدمی کی تو سارے بلقان میں آگ لگ جائے گی، کیونکہ برطانیہ رومانیہ کی حفاظت کی ذمہ داری لے چکا ہے اور اٹلی بھی روس کی اس مداخلت کو پسند نہیں کر سکتا، لیکن چونکہ اس دوران میں خود رومانیہ کے فرمانروا شاہ کیرل نے ڈکٹیٹروں کی سی حیثیت قائم کر لی ہے اور اس کا میلان نازی حکومت کی طرف زیادہ ہے اس لئے اگر وہ خود اپنی خوشی یا ہٹلر کی مرضی سے بسربیا روس کو واپس دینا پسند کرتا ہے تو برطانیہ کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہے، لیکن عجیب نہیں اگر بلغاریہ بھی اپنا کھویا ہوا علاقہ ڈبرو جبار رومانیہ سے واپس مانگے اور ہنگری بھی ٹرنسولینیا کا مطالبہ کرے۔ بلغاریہ روس کی طرف مایل ہے اور ہنگری جرمنی کی طرف اس لئے معاملہ پھر وہی روس و جرمنی کے سمجھوتہ کا رہ جاتا ہے اور چونکہ جرمنی کی موجودہ پالیسی بلقان میں جنگ چھیڑنے کی حامی نہیں ہے اور روس کی مصلحت اندیشی بھی جرمنی سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی اس لئے ممکن ہے کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ آسانی سے ہو جائے، لیکن اگر بلغاریہ نے اپنا مقدونیا والا علاقہ بھی یونان اور یوگوسلیویا سے لینا چاہا تو گپڑی الجھ جانے کا اندیشہ ہے اور پھر ترکی کو بھی اس آگ میں پھاندنا پڑے گا اور برطانیہ کو بھی

ایشیا پر اس وقت تک جنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا، لیکن فرانس اور ہالینڈ کی شکست نے انڈو چائنا اور ایسٹ انڈیز کے معاملہ کو البتہ اہم بنا دیا ہے اور جاپان دونوں پر لچائی ہوئی ٹکاپیں ڈال رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ قصداً چھپر ٹکا لکر ان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس صورت میں امریکہ کا خاموش بیٹھا رہنا مشکل ہو گا۔ سنگھائی میں بھی جاپان کی پالیسی جارحانہ صورت اختیار کرتی جاتی ہے اور برما کا نام بھی اس کی زبان پر کئی بار آچکا ہے، لیکن چونکہ مغربی حکومتیں اس وقت یورپ میں الجھی ہوئی ہیں اس لئے امید نہیں کہ جاپان کو اپنے اقدام کے لئے ان کی طرف سے کوئی بہانہ مل سکے بہر حال اس وقت تک ایشیا اور بلقان کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان سے متعلق جنگ کے امکانات پر بحث کی جائے

اور ہر چہرہ کو وقت کا سب سے زیادہ اہم سوال یہی رہتا ہے کہ اب جرمنی کیا کریگا

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جرمنی سمندر کے راستے سے اپنی فوجیں سواحل انگلستان پر اتارنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لئے ممکن ہے کہ وہ انگلستان کا محاصرہ کرنے کی فکر میں ہو۔ انگلستان کا مشرقی و جنوبی حصہ تو بیشک خطرہ میں ہے کیونکہ خلیج بسکے (English Channel) اور رودبار انگلستان دونوں طرف سے وہ برطانوی جہازوں کی آمد و رفت کو روک سکتا ہے اور سواحل بلجیم و فرانس پر برہنہ قسم کی توپیں نصب کر کے مشرقی سواحل انگلستان پر گولہ باری بھی کر سکتا ہے لیکن شمال و مغرب کے سواحل انگلستان ابھی تک خطرہ سے دور ہیں۔ اگر روس کے بیڑے نے جرمنی کی حمایت میں آئرلینڈ پر قبضہ کر کے شمالی راستہ بند کر دیا جس کا خطرہ تو پھر جرمنی ضرور آئرلینڈ کی طرف سے محاصرہ کی کوشش کرے گا بشرط آنکہ بحر روم میں برطانوی بیڑوں کو ابھائے رکھے اور فرانسیسی بیڑا بھی اس کے ہاتھ آجائے، لیکن چونکہ اٹلی کی طرف سے اس کی توقعات بلند نہیں ہیں اور فرانسیسی بیڑے بھی ہنوز اس کی دسترس سے باہر ہیں، اس لئے بحالات موجودہ جرمنی کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انتظار کرے یا کسی اور طرف برطانیہ کو ابھائے یا ہوسکی بحری قوت کو کئی جگہ تقسیم کر دینے کے بعد اس پر حملہ کرے۔

کیا جنگ میں ہمیں برطانیہ کا ساتھ دینا چاہئے

یہ ہے وہ سوال جو حلقہ نگار کے احباب کی طرف سے اس دوران میں مجھ سے بار بار کیا گیا ہے۔ گو اس کا جواب انفرادی طور پر بھی مستفسرین کو دیا جا چکا ہے، لیکن نگار کی وساطت سے بھی میں اپنی رائے اس باتیں ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں

اس وقت ہندوستان میں دو جماعتیں پائی جاتی ہیں ایک وہ جو یہاں برطانوی حکومت کے قیام کی حامی ہو اور دوسری وہ جو ملک کو بالکل آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور کسی غیر حکومت کو پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے اس جماعت سے بحث نہیں جو برطانوی حکومت کی طرفدار ہے، کیونکہ اس کو تو لامحالہ انگریزوں کی مدد کرنا ہی ہے، بلکہ میرا خطاب دوسری جماعت سے ہے جو ملک کو آزاد دیکھنا چاہتی ہے

کہا جاتا ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہیں کہ موجودہ جنگ نہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا کا نقشہ بدل کر رہے گی اور یقیناً ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بہت کچھ اس جنگ کے انجام پر منحصر ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک سوال ہے اور اس پر ہمارے طرز عمل کا انحصار ہونا چاہئے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اگر انگریزوں کو اس لڑائی میں شکست ہو گئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا؟

اس کا جواب مشکل نہیں۔ بحالات موجودہ ہندوستان کا انگریزی تسلط سے علیحدہ ہونا کسی نہ کسی دوسری حکومت کا غلام ہو کر رہنا ہے، خواہ وہ حکومت جاپان و جرمنی کی ہو یا روس کی۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہم نے انگریزوں کی مدد نہ کی تو زیادہ سے زیادہ ہندوستان کے حالات میں اتنا ہی تغیر ہو سکتا ہے کہ ہم بجائے ایک آقا کے دوسرے آقا کی خدمت پر مجبور ہوں اور ظاہر ہے کہ اس کو کوئی غیر ہندوستانی گوارا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان جس منزل سے گزر رہا ہے وہ یقیناً آزادی سے قریب تر ہے، لیکن اگر آج یہاں کوئی دوسری حکومت آجائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے پھر ان زنجیروں کو اپنے پاؤں میں ڈال لیا جن کو بمشکل ایک ایک کر کے توڑا تھا اور ہم کو آزادی کی جدوجہد پھر از سر نو کرنا پڑے گی جس کی کامیابی کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ اسوقت یہ خیال کرنا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے، تو ہم آزاد ہو کر خود اپنے ملک کی مدافعت کر لیں گے۔ بچوں کی سی باتیں ہیں۔ انگریزوں کی غلطی کہنے یا دانشمندی سب سے بڑی یہی تھی کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو اسوقت تک ملک کی حفاظت و مدافعت کے لئے طیار نہیں کیا جس کو اب وہ محسوس کر رہے ہیں اور یقیناً اس سے زیادہ سخت غلطی ہماری ہوگی اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنی حفاظت کے مسئلہ میں بدستور دوسروں ہی کا دست نگرینار ہنا پسند کیا۔

حکومت ہند نے اسوقت حفاظت ہند کے مسئلہ کو زیادہ وسعت نظر سے دیکھنے کا ارادہ کیا ہے اور ضرورت ہے کہ ہم نہایت حریصانہ طور پر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ علاوہ اس کے کہ حکومت کی موجودہ تجاویز مدافعت پر عمل کرنے سے ملک کی بیکاری کم ہوتی ہے، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد جدید اصول جنگ سے واقف ہو جائیں گے اور اگر کسی دشمن نے ہم پر حملہ کیا تو کم از کم یہ تو نہ ہوگا کہ بندوق کی شکل دیکھ کر جسم پر لرزہ طاری ہو جائے۔

اس لئے میری آزادانہ رائے یہی ہے کہ اسوقت ہم کو جو درجہ فوج میں بھرتی ہونا چاہئے اور جو نوجوان تعلیم یافتہ ہیں ان کو خصوصیت کے ساتھ بحری و فضائی فوج میں داخل ہونے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیونکہ سوال اسوقت انگریزوں کی مدد کا نہیں بلکہ خود اپنی مدد کا ہے اور اگر اسوقت ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پسند نہیں کرتے اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ آزادی کا لفظ زبان سے نکالیں۔

دنیا میں تاریخوں کو پلٹ دینے والی ساعتیں شاید دوناور ہی کبھی آتی ہیں اور اسوقت ہندوستان انھیں ساعتوں سے گزر رہا ہے، پھر اگر ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو یہ غلطی نہ انگریزوں کی ہوگی نہ انگریزی حکومت کی بلکہ ہماری غلطی ہوگی اور ایسی سخت غلطی جس کی تلافی شاید کبھی ممکن نہ ہو!

عربوں کی سیاسی بیداری

(جنگ عظیم کے بعد)

(مسلل)

جنگ عظیم کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار عرب کی قومی تحریک اپنی قسمت کے فیصلہ کی منتظر تھی۔ شریف حسین نے عرب حکومت کے جو حدود متعین کئے تھے وہ تمام کے تمام ترکوں کی غلامی سے آزاد ہو چکے تھے، قومی تحریک کے لیڈر اور عوام اپنی جگہ پر مطمئن تھے کہ شریف حسین نے برطانیہ سے جو وعدے کئے تھے انکو عربوں نے پورا کر دیا۔ اب عربوں کی نظریں برطانیہ پر لگی تھیں کہ وہ بھی اپنے وعدے پورے کرے۔ مگر جب صلح کانفرنس میں ایف اے عہد کا وقت آیا تو صورت حال بالکل مختلف تھی اور وہاں عجیب عجیب انکشافات ہوئے، برطانیہ شریف حسین سے جو وعدے کئے تھے ان کی اب نئی نئی تاویلیں ہونے لگیں جو عربوں کے خیال میں کبھی نہ آ سکتی تھیں۔

۱۹۱۹ء میں آزاد شدہ عرب علاقوں کی حیثیت ایک "مفتوحہ علاقہ" کی سی تھی جہاں مارشل لا کا دور دورہ تھا اور تمام انتظامی احکامات برطانوی کمانڈر انچیف سے حاصل کئے جاتے تھے، ملک کو مختلف حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا، اور ہر حصہ میں مختلف انداز کی حکومت تھی۔ عراق کی حکومت کا افسر اعلیٰ برطانوی سول کمشنر کو مقرر کیا گیا اور وہاں تمام اعلیٰ افسرانگریزی ہی تھے۔ شام اور فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک پیرس انگریزی حکومت، دوسرا میں فرانسیسی اور تیسرا میں عرب حکومت قائم کی گئی۔

صلح کانفرنس میں حجاز کی نمائندگی کے لئے جب فیصل پیرس پہونچا تو اس نے دیکھا کہ عربوں سے اتحادیوں نے جو وعدے کئے ہیں ان کی راہ میں تین طاقتیں حائل ہیں۔ عراق و فلسطین میں برطانوی شہنشاہی مفاد، شام میں فرانس کا شہنشاہی مفاد اور فلسطین میں یہودیوں کا قومی مفاد۔ فیصل ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء کو مارسیل (Marseilles) پہونچا۔ دو فرانسیسی افسروں نے جہاز پر اس کا خیر مقدم کیا اور یہ بھی بتلایا کہ

حکومت فرانس اُس کا استقبال بحیثیت ایک سیاح کے کر رہی ہے اور کسی حال میں بھی اُس کی نایندہ حیثیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نہایت شائستہ الفاظ میں اُس کو مغربی محاذ جنگ کے معائنہ کی بھی دعوت دی گئی، فیصل نے بھی اُسی شاہکی کے ساتھ دعوت قبول کی۔ ۱۳ دسمبر کو فیصل لندن پہونچا یہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا اور اُس کو ہر طرف پاپوسی کی فضا نظر آئی۔ دو ایک روز بعد اس کو معلوم ہوا کہ سائیکس پی کاٹ معاہدہ (Sykes-Picot Agreement) صرف بالشوکوں کا پروپیگنڈا نہ تھا بلکہ یہ ایک سنگین حقیقت ہے۔

اُس زمانہ میں ہر جگہ یہی معاہدہ زیر بحث تھا۔ خصوصاً برطانیہ اور فرانس کے مابین تو اس مسئلہ نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ فرانس معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے پر مصر تھا اور برطانیہ کو اس سے گریز تھا۔ برطانیہ کا استدلال یہ تھا کہ یہ معاہدہ روس، برطانیہ اور فرانس کے مابین ہوا تھا اب جبکہ روس اُس معاہدہ سے دستکش ہو گیا تو اسکو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہئے۔ نیز برطانیہ اس معاہدہ کو ناقابل عمل بھی سمجھ رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہی کہ اس سے برطانیہ کے مفاد کو شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ بھی تھا۔

اس معاہدہ کی رو سے اول تو ولایت موصل فرانس کے حصہ میں آتا تھا، جہاں لاتعداد تیل کے چشمے تھے، دوسرے فلسطین کو ایک بین الاقوامی انتداب کے حوالہ کرنا پڑتا اور پھر وہاں برطانیہ کا کوئی اقتدار باقی نہ رہتا۔ جب لائڈ جارج نے دیکھا کہ فرانس اپنی ضد پر اڑا ہے تو اُس نے ایک دوسری تجویز فرانس کے سامنے پیش کی اور وہ یہ کہ فرانس بخوشی موصل اور فلسطین برطانیہ کے حوالہ کرے اور اُس کے معاوضہ میں اُس کو دوسرا علاقہ دیدیا جائے، نیز موصل کے تیل کے چشموں میں بھی فرانس کا حصہ رہے۔ یہ تجویز فرانس نے بڑی مشکلوں سے قبول کر لی۔

فیصل کو تفصیل کے ساتھ تو نہیں مگر سرسری طور پر حالات سے آگاہ کیا گیا اور برطانیہ نے اُس پر زور ڈالا کہ لائڈ جارج کی تجویز کی وہ بھی تصدیق کر دے۔ سب سے زیادہ زور فلسطین کے علاقہ کے لئے ڈالا گیا کہ عربوں کی طرف سے وہ برطانیہ کی اسکیم منظور کر لے۔ دوسری طرف یہودی بھی زمین و آسماں کے قلابے مار رہے تھے کہ وہ یہودیوں سے ایک معاہدہ کر لے۔ فیصل کی جان سخت مصیبت میں پھنسی تھی اُسکے وہاٹ ہال (White Hall) کے دوست وہ شرطیں اُس سے منوانا چاہتے تھے جو اُس کے مشن کے بالکل منافی تھیں۔ اُس نے اپنے باپ کے احکامات حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہاں سے صاف جواب آیا کہ برطانیہ نے عربوں سے جو وعدے کئے ہیں ان کا ایفاء اور مکمل آزادی سے کم کوئی چیز قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یورپ میں فیصل کا شناسا سوا انگریزوں کے اور کون تھا جن سے وہ مشورہ کرتا۔ چنانچہ اُس نے لارنس (Lawrence) سے مشورہ کیا اُس نے وہی مشورہ دیا جو دفتر خارجہ کا مشورہ تھا۔ لارنس نے بھی فیصل پر زور ڈالا کہ وہ یہودیوں سے معاہدہ کر لے مگر اس شرط کے ساتھ کہ عرب کو مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

خاموشی اختیار کی۔

لوگوں کا بیان ہے کہ اس خفیہ اجلاس کی اطلاع جب فیصل کو ہوئی تو اس نے زندگی میں پہلی بار شراب پی اور جی کھول کر پی، پھر موٹر پر بیٹھ کر برطانوی اور امریکی نمائندوں کے پاس گیا اور وہاں صوفوں کے گدوں کو چٹخ کر کہا کہ میرے پاس بم کے گولے نہیں ہیں اس لئے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کر رہا ہوں۔

اوائل مئی میں فیصل دمشق واپس لوٹا، اس نے دیکھا کہ مستقبل کے متعلق لوگوں کے اندر شدید سچی و اضطراب ہے۔ عوام اور لیڈروں کا اصرار تھا کہ وہ صاف صاف

فیصل کی دمشق کو واپسی

بیان کرے کہ برطانیہ اپنے وعدوں کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ اپنی ناامیدیوں اور تلخ تجربات کو اس نے ایک محدود طبقے تک محدود رکھا اور عوام کو مطمئن کرنے کی اس نے پوری کوشش کی مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ملک کے ذمہ دار لیڈروں نے ایک قومی اسمبلی کے قیام کی تجویز عوام کے سامنے پیش کی جس کی ہر طرف سے تائید ہوئی۔ ایک خفیہ انجمن ”حزب الاستقلال العرب“ کے نام سے بنائی گئی۔ فیصل نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ فوجی تحریک کے سلسلہ میں کوئی غیر آئینی اقدام ظہور میں نہ آئے جلدی جلدی اس اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے اور دوسری جولائی کو دمشق میں اس کا اجلاس (General Syrian Congress) کے نام سے منعقد ہوا۔ شام کے بعض علاقوں کے نمائندوں کو فرانسیسی حکومت نے جبراً شرکت کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ ۸۹ نمبروں میں صرف ۶۵ نمبر شرکت کر سکے۔ ان نمائندوں میں عیسائیوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی اس کا نفرنس نے متعدد تجاویز پاس کیں اور ایک بیان ملک کی موجودہ حالت کے متعلق شائع کیا یہ بیان اپنی نوعیت کے اعتبار سے سچا اہم تھا ان تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

(۱) شام کو (معد فلسطین کے) آزاد و خود مختار تسلیم کیا جائے۔

(۲) امیر فیصل کو شام کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔

(۳) عراق کی آزادی تسلیم کی جائے۔

(۴) سائیکس پی کاٹ معاہدہ۔

بلفور اعلان (Balfour Declaration) اور ان تمام معاہدات کو منسوخ کیا جائے جنہیں

شام کی تقسیم اور فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام کی تجویزیں ہیں۔ کانفرنس کی تمام تجاویز قومی جذبات کے مظاہروں کے

ساتھ بلا کسی مخالفت کے پاس ہوئیں۔ ان تجاویز کی تائید تمام ملک نے کی اور ہر جگہ سڑکوں پر اس کی حمایت میں مظاہر

کئے گئے، ملک کے اخباروں میں جلی حرفوں میں ان تجاویز کو شائع کیا گیا۔

کنگ کرین رپورٹ (King Crane Report) صلح کانفرنس کی مجوزہ تحقیقاتی کمیشن کے سلسلہ میں برطانیہ اور فرانس نے پوری مخالفت کی، اٹالیہ کا چونکہ اس میں کوئی مفاد نہ تھا اس لئے اس نے لاپرواہی برقی، صرف پریسیڈنٹ ولسن کی ایک ذات تھی جو اپنی تجویز پر قائم رہی اور جب اس نے فرانس و برطانیہ کی مخالفت کو محسوس کیا تو اسے یہی مناسب نظر آیا کہ امریکہ کم از کم اپنے نمائندوں کو تحقیقات کے لئے ضرور روانہ کرے چنانچہ امریکی نمائندے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اُن کی مرتبہ رپورٹ کنگ کرین رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن نے چھ ہفتے تک شام و فلسطین کے اندرونی علاقوں کا دورہ کیا۔ ۲۰ مقامات پر قیام کر کے مختلف لوگوں سے تبادلاً خیال کیا اور تفتیش حالات کئے۔ اپنا دورہ ختم کرنے کے بعد یہ لوگ قسطنطنیہ گئے اور وہیں رپورٹ مرتب کی۔ اگست کے آخری ہفتہ میں پیرس واپس آئے۔ اور ۲۸ اگست کو رپورٹ متحدہ امریکہ کے دفتر کے حوالہ کی۔ اس کے فوراً ہی بعد ڈاکٹر کنگ (Dr. King) امریکہ لوٹے تاکہ جلد سے جلد رپورٹ کی نقل پریسیڈنٹ ولسن کے حوالہ کریں۔

اب کنگ کرین رپورٹ عوام کی ملکیت تھی، شروع میں اس کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پریسیڈنٹ ولسن نے پوری رپورٹ پڑھی بھی یا نہیں مگر اس کے خلاصہ سے ان کو ضرور واقفیت تھی کیونکہ دونوں کشنروں نے بذریعہ تار اپنی تحقیقات کے خلاصہ سے اُن کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ ۲۲ء میں جب رپورٹ کی اشاعت کی اجازت اُن سے طلب کی تو وہ فوراً اس کے لئے طیارہ ہو گئے لیکن پوری رپورٹ صرف امریکی اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ ایک اہم ترین دستاویز ہے، خصوصاً مورخین کے لئے کیونکہ صرف اسی رپورٹ میں ایسا مواد دستیاب ہو سکتا ہے جو غیر جانبداروں کا فراہم کیا ہوا ہے اور جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ صلح کانفرنس کے بعد عربوں کے جو جذبات اور خیالات تھے اُن کو نہایت تفصیل کے ساتھ اس رپورٹ میں قلمبند کیا گیا ہے۔

کمیشن نے شام، فلسطین اور عراق کے لئے انتداب کو فردری سمجھا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ انتداب ایک معین و محدود وقت کے لئے ہو اور مقصود صرف یہ ہو کہ ملک کے تمام حصے جلد از جلد آزاد ریاست کی شکل اختیار کر سکیں۔ کمیشن نے یہ بھی تجویز کیا کہ عراق کو ہرگز تقسیم نہ کیا جائے اور پورے ملک کے لئے ایک انتداب ہو۔ شام (مع فلسطین) کے اتحاد کو بھی برقرار رکھا جائے اور عراق کی طرح سے شام کے لئے بھی ایک انتداب ہو جس میں فلسطین کا علاقہ بھی شامل رہے، دونوں علاقوں میں دستوری شہنشاہیت عمل میں لائی جائے۔ امیر فیصل کو شام کا بادشاہ اور کسی عرب حکمران کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی کوشش کی جائے۔ انتداب کے انتخاب کے باب میں کمیشن نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ملک کی رائے عامہ سب سے پہلے امریکہ کو ترجیح دیتی ہے اور پھر برطانیہ کو، فرانس کا انتداب تو قبول کرنے کے لئے وہ کسی حال میں بھی طیار نہیں چنانچہ تمام حالات پر بحث کرتے ہوئے کمیشن نے مشورہ دیا ہے کہ انتداب کے لئے متحدہ امریکہ سے استدعا کی جائے اگر وہ طیار نہ ہو تو پھر برطانیہ کے سپرد کیا جائے

لیکن اگر فرانس کے سپرد یہ علاقہ کیا گیا تو عربوں اور فرانسیسیوں میں یقیناً جنگ ہوگی۔

میکیشن نے یہودیوں کے مسئلہ پر بھی کافی بحث کی اور بتلایا کہ تحقیقات شروع کرتے وقت وہ لوگ یہودیوں کی اسکیم کے موافق تھے مگر دوران تحقیقات میں یہودی نمائندوں نے جو بیانات دئے ان سے معلوم ہوا کہ وہ مختلف چالاکوں سے عربوں کی جائزادیں خرید رہے ہیں اور اس طرح سے ان کی یہ کوشش ہے کہ فلسطین میں عربوں کا کوئی حصہ نہ رہے۔ یہودیوں کی اسکیم ملک کے باشندوں کے حقوق و مفاد کو بری طرح پامال کر رہی ہے نیز برطانیہ اور پریسیڈنٹ ولسن نے جو اصول مرتب کئے ہیں، یہ اسکیم ان کے بالکل منافی ہے۔ جس برطانوی افسر سے میکیشن نے گفتگو کی اُس نے بھی بتلایا کہ یہ اسکیم صرف تلوار کی طاقت سے کامیاب ہو سکتی ہے، چنانچہ میکیشن نے یہ تجویز کیا کہ یہودیوں کا داخلہ بالکل محدود کر دیا جائے اور فلسطین کو یہودی ریاست کی شکل میں تبدیل کرنے کا خیال چھوڑ دیا جائے۔ یہ تجاویز ظاہر ہے کہ برطانیہ، فرانس اور یہودی تینوں کے لئے کس درجہ تلخ تھیں۔ چنانچہ اس رپورٹ کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی اور اُس کی اشاعت سے پہلے ہی دونوں طاقتوں میں آپس میں سمجھوتہ کر کے ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔

فیصل کا دوسرا سفر یورپ اور اُس کے نتائج

اگست میں لائڈ جارج نے فیصل کو دوبارہ یورپ آنے کی دعوت دی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب برطانیہ و فرانس کے تعلقاً عرب معاملات کی وجہ سے خطرناک حد تک کشیدہ ہو چکے تھے۔ فرانس کے تمام سیاستداں اور کل اخبارات برطانیہ کو بدبینی اور وعدہ خلافی کا مجرم گردان رہے تھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ انگریز عربوں کو شام میں فرانس کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فیصل کے لندن پہنچنے سے قبل لائڈ جارج نے ایک تجویز فرانس کے سامنے پیش کی اور فرانس نے اُس کو قبول کر لیا۔ جب فیصل کے لندن پہنچنے کے بعد وہ تجویز اُس کے سامنے پیش کی گئی، تو وہ بے حد برا فرد ختم ہوا اور فوراً ایک احتجاجی بیان قلمبند کر کے وزیر اعظم کے حوالہ کیا۔ اس چیز نے برطانیہ کو سخت الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اب برطانیہ نے یہ سوچا کہ فرانس اور عرب کے مابین اگر کوئی معاہدہ ہو جائے تو اس سے برطانیہ کی پوزیشن بڑی حد تک صاف ہو جائے گی چنانچہ برطانوی وزراء نے فیصل پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ بالواسطہ فرانس سے گفت و شنید کرے۔ فیصل کو انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر فرانس کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔ ۲۷ نومبر کو فیصل نے فرانس کے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور پہلی ہی ملاقات میں معاملہ طے ہو گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ عرب حکومت لبنان اور شام کے ساحلی علاقہ کو جو شمال میں سنجاق تک ہے، فرانس کا مقبوضہ تسلیم کرے گی۔ نیز عرب حکومت کو جس قسم کی امداد درکار ہوگی، فرانس اُس کو فراہم کرے گا۔ فیصل نے کرنے کو تو یہ معاہدہ فرانس کے ساتھ کر لیا مگر اس قسم کا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کو کوئی حق نہ تھا اس کے باپ شریف حسین نے بھی جو ہدایات اُس کو دی تھیں یہ معاہدہ اُس کے بالکل منافی تھا۔ اور یہ معاہدہ شام کی رائے عامہ کے بھی بالکل خلاف تھا چنانچہ شام پر اس کا بھید اثر پڑا۔

جب شام میں اس معاہدہ کی خبر پہنچی تو ہر طرف شدید بھینپنی اور اضطراب کے آثار نظر آنے لگے۔ عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ فیصل نے ملک کو فرانس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ فیصل کو جب ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اُس نے فوراً شام کا رخ کیا۔ یہاں ہر جگہ اُس کا سرد مہری سے استقبال کیا گیا۔ سڑکوں پر عام طور سے آزادی اور اتحاد کے مظاہرے کئے گئے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ عرب لیڈر اور عرب رائے عامہ اس معاہدہ سے کس قدر غیر مطمئن ہے۔

دمشق میں ملک کے ہر حصہ سے لیڈر، طلبہ اور عرب افسر جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور آزادی و اتحاد کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔

۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو جنرل سیرین کانگریس (General Syrian Congress) کا اجلاس ہوا۔ اُن تمام لیڈروں نے اس اجلاس میں شرکت کی جنہوں نے بغاوت میں پورا حصہ لیا تھا اور ملک میں جن کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی اجلاس میں شام (مع فلسطین) کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی امیر فیصل کو بادشاہ منتخب کیا گیا۔ اسی طرح عراقی لیڈروں نے بھی اپنے ایک جلسہ میں عراق کی آزادی اور دستوری شہنشاہیت کے قیام کا اعلان کیا اور وہاں کا بادشاہ امیر عبداللہ کو منتخب کیا گیا۔ فرانس و برطانیہ کی حکومتوں نے اس کانفرنس کی تجویز اور اُس کے اعلان کو قبول کرنے کے بجائے "ناجائز" قرار دیا اور فوراً مجلس اعلیٰ (High Commission) کا اجلاس طلب کیا۔ فیصل کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ برطانیہ و فرانس کی حکومتوں نے سیرین کانگریس کے اعلان کو ٹھکرا کر صرف عہد شکنی ہی کے جرم کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ بہت بڑی سیاسی غلطی بھی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیصل کے لئے اب اس کانفرنس میں شرکت کا مسئلہ عید پیچیدہ ہو گیا۔

سین ریمو (San Remo) میں ۲۵ اپریل کو مجلس اعلیٰ (High Commission) کا اجلاس ہوا۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ تمام علاقہ جو بحیرہ روم سے لیکر خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے وہاں انتداب کا قیام طے پایا۔ فرانس و برطانیہ نے اپنے اپنے مفاد کے مطابق شام کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ فرانس کے حصہ میں شام و لبنان کا علاقہ آیا، برطانیہ کو عراق و فلسطین کا علاقہ ملا۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ بالفور اعلان (Balfour Declaration) کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ یہ تجاویز ۵ مئی کو شائع ہوئیں اور اُس کی اشاعت کے ساتھ ہی عرب عوام میں مغربی طاقتوں کے خلاف غصہ و نفرت کی آگ مشتعل ہو گئی۔ کیونکہ عربوں کی تمام قربانیوں کو جن کی وجہ سے اتحادیوں کو کامیابی نصیب ہوئی تھی، پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

فرانس کا دمشق پر حملہ
سین ریمو (San Remo) کانفرنس کے اختتام کے ساتھ ہی عربوں اور فرانسیسیوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ فرانس کو انتداب حاصل

ہو جانے کے بعد فیصل پر ہر طرح کا زور ڈالنے کا موقع ملا جس کی فرانس کو عرصہ سے تمنا تھی، دوسری طرف عرب فیصل کو فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ فیصل نے اس سے قطعاً انکار کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فیصل کو برطانیہ اور امریکہ سے انصاف کی امید تھی۔ چنانچہ فیصل نے اب پھر سفرِ یورپ کا قصد کیا۔ لیکن ابھی اس سفر کے انتظامات پایہ تکمیل کو نہیں پہنچے تھے کہ فرانس کا ایک الٹیمیٹم موصول ہوا، جس میں دمشق کی عرب حکومت کے خلاف ایک طویل فرد جرم پیش کی گئی تھی، اس کے ساتھ ہی ایک بیان بھی منسلک تھا جس میں مصالحت کی پانچ شرطیں درج تھیں :-

- (۱) ریاق علی پوریلوے لائن (Rayyag Aleppo Rly) فرانس کے فوجی نظم و نسق کے سپرد کر دی جائے
- (۲) جبرہ فوجی بھرتی ختم کر دی جائے اور عرب کی فوجی طاقت بڑی حد تک کم کر دی جائے۔
- (۳) فرانسیسی حکومت کا (Currency System) قبول کیا جائے۔
- (۴) فرانس کا انتداب غیر مشروط طریقہ پر تسلیم کیا جائے۔
- (۵) فرانس کے مخالفین کو سزا دی جائے۔

ان شرائط کی تکمیل کے لئے صرف چار دن کا موقعہ دیا گیا تھا ”اور اگر اس عرصہ میں یہ شرطیں پوری نہ کی گئیں تو حکومت فرانس ہر اس اقدام کے لئے آزاد ہوگی جس کو وہ مناسب سمجھے“

فیصل کے ساتھیوں کے غصہ و تعجب کی کوئی انتہاء نہ تھی جب ان کو معلوم ہوا کہ فیصل نے ان شرائط کو قبول کر لیا ہے۔ خود فیصل کو اس کا پورا احساس تھا کہ یہ اقدام تمام ملک میں اس کو غیر ہر دل عزت بنادے گا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ فرانس آمادہ جنگ ہے اور اس وقت مصلحت یہی تھی کہ جنگ کو ٹال دیا جائے تاکہ اُس کو ایک بار لندن جانے کا موقع ملے اور وہاں بالکل مختلف انداز میں وہ پورے مسئلہ کو از سر نو اٹھائے۔ برطانیہ کی خوش نیتی پر اعتماد اب بھی اس کی پالیسی کا ایک لاینفک جزو تھا۔ نیز فرانس کے الٹیمیٹم کے ساتھ ہی لارڈ کرزن کا ایک تار بھی موصول ہوا، جس میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اس وقت ہر ممکن قیمت پر لڑائی سے گریز کیا جائے۔ چنانچہ فیصل نے تمام شرطیں قبول کر لیں اور انکی تکمیل کا انتظام بھی شروع کر دیا۔ مگر اس کے باوجود فرانس کی فوجیں دمشق کی سمت بڑھنے لگیں۔ اس خبر کو سنکر پورا شہر اور قرب وجوار میں ایک ہلچل مچ گئی۔ فیصل نے صورت حال پر قابو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش میں تقریباً سو عرب خود اُس کی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ مگر فیصل کو کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر مقامی فوج کے دوش بردوش دو ہزار مجبان قوم بھی جا کھڑے ہوئے۔ فرانسیسی توپوں اور ہوائی جہازوں کے سامنے نیم مسلح اور غیر مسلح فوج کیا ٹھہرتی مگر ان لوگوں نے بڑی بہادری کے ساتھ جم کر مقابلہ کیا۔ حکومت شام کا وزیر جنگ یوسف اللہ اعظم بھی اسی لڑائی میں کام آیا۔ فرانسیسی فوج نے دمشق میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے دمشق

خالی کرنے کا حکم دیا جس کی اُس نے فوراً تعمیل کی اور وہاں سے نکل کر اُس نے سیدھے اٹلی کا رخ کیا۔ کچھ دنوں تک لیک مگیور (Lake Maggiore) میں قیام کیا۔ دسمبر میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا اور اُس کے جواب میں وہ لندن کے لئے روانہ ہوا۔

مسلم عرب بغاوت عربوں کی تاریخ میں ۱۹۱۷ء کو فلاکت اور بدبختی کا سال سمجھا جاتا ہے۔ سین ریمو کانفرنس کے بعد اسی سنہ میں فرانس نے شام پر قبضہ کیا۔ عراق پر انگریزوں کا تسلط ہوا اور فلسطین میں یہودی اسکیم کا اجرا شروع ہوا، دوران جنگ میں عربوں اور اتحادیوں کے مابین جو معاہدات ہوئے تھے ان کو پروئے کا لانے کے لئے اُسی سال عربوں نے مسلح بغاوت کی، شام، فلسطین اور عراق میں ہر جگہ بلوے ہوئے، غرض اُس وقت ملک کے گوشہ گوشہ میں بے اطمینانی کی لہر دوڑ رہی تھی، اور ہر جگہ سے جارحانہ اقدامات کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ فساد کی آگ سب سے پہلے فلسطین میں ایسٹر (Easter) کے موقع پر مشتعل ہوئی۔ بیت المقدس کی عرب آبادی نے یہودی لیڈروں کی تقریریں سنیں جن میں فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام اور عربوں کو نکالنے کا ذکر تھا، عرب ان بیانات کو سنکر مستقبل کی طرف سے بید خالی ہوئے اور اسی گھبراہٹ میں انھوں نے یہودی آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس فساد کے اسباب پر سرکاری طور سے آج تک کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ برطانوی کمانڈر انچیف نے تحقیقات کے لئے ایک کمیشن ضرور مقرر کیا۔ حکومت نے اس کی رپورٹ کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔ عوام کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ کمیشن کے خیال میں اس فساد کے اسباب قطعاً سیاسی تھے اور عرب آبادی نے جو کچھ کیا وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو کر کیا۔

شام پر فرانس کے قبضہ کے ساتھ ہی فسادات بھی شروع ہوئے۔ سب سے زیادہ خونیں فسادات عراق میں رونما ہوئے۔ یہ فسادات دراصل انتداب کے خلاف صرف مظاہرے تھے۔ اہل عراق برسوں سے آزادی اور اتحاد کی خاطر اپنا خون بہا رہے تھے لیکن جب آزاد ہونے کا وقت آیا تو ان کے سرانتداب تھوپا جا رہا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ برطانیہ کا طوق غلامی ان کی گردن میں ڈالا جا رہا ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے ان لوگوں نے اپنی مخالفت کا اظہار کیا، لیکن حکومت نے ان مظاہروں کے سد باب کے لئے قوت کا استعمال ضروری سمجھا۔ ملک کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے مقدمات کی سرسری سماعت کر کے سب کو سزائیں دیدی گئیں۔ اس چیز نے عربوں کے غم و غصہ کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ جون کے آخری ہفتہ میں ایک فساد وادی فراط میں رونما ہوا۔ یہ فساد اپنی نوعیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ خونیں فساد تھا۔ اس کا سلسلہ جون سے شروع ہو کر اگست تک جاری رہا۔ عرب مقتولین کی صحیح تعداد کا تو کوئی علم نہیں مگر لوگوں کا اندازہ ہے کہ کم از کم ۴ ہزار عرب جانیں اس فساد میں ضائع ہوئیں۔ اس فساد کا مقابلہ کرنے اور شورش کا سرکچلنے کے سلسلہ میں برطانیہ کے خزانہ پر ۴۰ کروڑ پونڈ (تقریباً ۶۰ کروڑ روپیہ) :

کا بار پڑا۔ خود اہل عراق کا کتنا مالی نقصان ہوا اس کا کوئی تخمینہ موجود نہیں ہے۔

برطانیہ نے مجبوراً عرب نما برطانوی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی عرب وزراء کا تقریب بھی عمل میں آیا، ہر وزیر کے ساتھ ایک برطانوی مشیر بھی تھا اور انتظامات کی باگ ڈور خود سول کمشنر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو عرب حکومت تو کسی طرح بھی نہیں کہا جاسکتا مگر اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ عرب و برطانیہ کے درمیان جو اختلافات کی خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ بڑی حد تک پُر ضرور ہو گئی۔ آگے چلکر عراق کو سیاسی آزادی دیدی گئی اور انتخاب کو منسوخ کر دیا گیا۔

مسٹر چرچل وزیر نوآبادیات کی تجویز پر عرب کے برطانوی عمال کی ایک کانفرنس قاہرہ میں طلب کی گئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل فیصل نے لندن میں برطانوی عمال سے طویل ملاقاتیں کیں، ان میں چرچل اور کرنل لارنس کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ فیصل اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا اور یہ طے پایا کہ برطانیہ عراق کا تمام نظم و نسق عرب حکومت کے حوالہ کر دے۔ نیز فیصل کو عراق کا بادشاہ منتخب کرانے کی پوری کوشش کرے۔

قاہرہ کانفرنس ۱۲ مارچ کو منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں یہ طے پایا کہ فیصل اور چرچل کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا دیا جائے۔ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کانفرنس نے بڑی حد تک وہ وعدے پورے کر دیے جو برطانیہ نے انگریزوں سے کئے تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس کانفرنس میں عراق کو یقیناً سیاسی آزادی ملی مگر عرب کے مغربی حصوں کا جہاں تک تعلق ہے برطانیہ پر بدعہدی کا الزام بدستور قائم رہتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی

”نگار“ کے پرانے پرچے

”نگار“ کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:-

(۱۶ء) جنوری ۵ء۔ (۱۷ء) مئی ۴ء۔ (۱۸ء) جولائی تا دسمبر ۴ء فی پرچہ۔ (۱۹ء) جنوری ۱۲ء
فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ۴ء فی پرچہ۔ (۲۰ء) فروری و جولائی ۴ء فی پرچہ۔ اکتوبر ۵ء۔ (۲۱ء)
جنوری ۶ء۔ فروری تا دسمبر (علاوہ مئی تا اکتوبر) ۵ء فی پرچہ۔ (۲۲ء) جنوری ۷ء۔ مارچ تا اگست ۶ء فی پرچہ۔
جنوری ۸ء۔ (۲۳ء) جنوری ۸ء۔ فروری تا دسمبر (علاوہ اگست و ستمبر) ۸ء فی پرچہ۔
فروری تا دسمبر (علاوہ جون و دسمبر) ۶ء فی پرچہ۔
نیچر نگار لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال

میرے نزدیک سب سے دلچسپ اور مستند خطوط وہ ہوتے ہیں جو تلف کردئے جائیں یا منظرِ عام پر نہ آئیں۔ اس لئے بڑا ہے ایسے خطوط کا قایل نہیں ہوں جو شائع کئے جائیں چہ جائیکہ ان پر مقدمہ لکھا جائے اور ان کی تشریح و تحلیل کی جائے اس اعتبار سے نیاز صاحب اور میں دونوں قصور وار ہیں، لیکن اکثر سیری چیز سبک کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ گو میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نیاز صاحب یا میں خود کشی کر لوں یا انہیں سے کوئی سنگسار کیا جائے تو سبک کی دلچسپی کئی گونہ بڑھ جائیگی! خطوط بالعموم ایسے لوگوں کے محفوظ رکھے جاتے ہیں یا ان کو شائع کیا جاتا ہے جو سبک کی نظروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے اہم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ایسے لوگ جو اپنے آپ کو کسی نہ کسی حیثیت سے اہم سمجھتے ہیں، کبھی بے تکلف بے محابا یا بے جھپک ہونا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے ایسے لوگ بھی ہوں جو اپنی اہمیت کو اکثر بھول جایا کرتے ہوں لیکن وہ کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ لوگ بھی انہیں بھول جایا کریں۔ چنانچہ ایسے لوگ جب کبھی اپنے خیالات سپرد قلم کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ غیر شعوری طور پر بھی اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ کوئی چیز قلم سے ایسی نہ برآمد ہوئی چاہئے جس پر ادبی، اخلاقی یا کسی اور نوعیت سے حرفِ فکری کیجا سکے اور یہی وہ احتیاط ہے جو خطوط کی ساری دلکشی یا اہمیت غارت کر دیتی ہے۔ خطوط نویسی ہی ایسا 'فن' ہے جس کی تعمیر میں اصل معنوں میں "مضمّن ہے اک صورتِ خرابی کی"

خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے۔ جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔

خط اور دوسرے قسم کے مضامین لکھنے والوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ خط لکھنے والا سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت میں ہے اس کو کسی قسم کی بدگمانی یا خطرہ نہیں ہوتا۔ وہ وہی چیز لکھتا ہے جو اس کے دل سے نکلتی ہے اور براہِ راست نوکِ قلم سے برآمد ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگ اس امر کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی تحریر منظرِ عام پر آئے گی اس کے حسن و قبح یا عواقب پر ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑیں گے اس لئے وہ دلی دلولوں کو بے اختیار نہیں ہونے دیتا اور جو کچھ لکھتا ہے اس کو دماغ کے خنجر سے نکالتا ہے اور دل کو "پاسانِ عقل" کی معیت سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ دنیا کی مستقل تصانیف کا یہی حال ہے اس لئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ دنیا کی تمام تصانیف کم و بیش صرف منافقت یا

لکھا گھیت سے لبریز ہوتی ہیں یعنی جھوٹے سچ اور سچے جھوٹ کا ایک منظم پشمارہ !

خطوط کا میں احترام کرتا ہوں اس لئے کہ اصلی خطوط اس قسم کی بے عنوانیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بالعموم لوگ اپنی تصانیف کو شایع کرنا اور خطوط کا پرائیوٹ رکھنا یا چاک کر ڈالنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تصانیف پیشہ کی اور خطوط شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی اصلی سیرت یا شخصیت کو منظر عام پر لانے کی جرات ہو۔

داعی اسلام کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ مرعوب اور متاثر کر رکھا ہے وہ میری ایک کمزوری ہے یعنی میں کبھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا کہ میری پرائیوٹ زندگی کی تمام جزئیات منظر عام پر آئیں یا لائی جائیں۔ رسالتاب کا ضبط ظن دیکھئے کہ مقرب ترین اصحاب حتیٰ کہ ازدواج مطہرات کو اس امر کی ہدایت تھی کہ روحی فداک کی زندگی کے ہر جزو فعل تک کی خبر دوسروں تک پہنچائیں اور وہ بھی اس لئے کہ وہ اسوہ حسنہ تھے ! اس محک آتشیں پر آزمائے جانے پر کون آمادہ ہے ؟

خطوط، لکھنے والے کی سیرت کے اصلی خط و خال ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ بے لاگ لکھے گئے ہوں اور اگر بے لاگ نہیں لکھے گئے ہیں تو ان سے زیادہ بے کار محض کوئی اور چیز نہیں کیونکہ ان پر خط کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ چیز محض مضمون آفرینی یا مضمون نویسی ہوتی ہے جس کا کسی حد تک قابل برداشت نمونہ شعر و شاعری ہے۔ انسان کی اصلی سیرت کی غمازی اکثر دو چیزیں کرتی ہیں یعنی وہ موجود ہو تو اس کے ساتھ کھیلنے وہ کھل جائیگا، اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط دیکھئے وہ پکڑا جائے گا۔

میں اکثر اپنے طلباء سے کہا کرتا ہوں کہ زندگی کی جنگ میں ممکن ہے مخلص نہ ہونا فائدہ بخش بھی ہو لیکن انشا پروردگار میں مخلص نہ ہونا مہلک ہے، لکھو جو تم محسوس کرتے ہو نہ یہ کہ دوسروں نے کیا محسوس کیا ہے یا کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اگر ہر انسان اپنے حلیہ سیرت اور تشخصات کے اعتبار سے منفرد ہے تو بحیثیت انشا پروردگار کیوں نہ منفرد ہو۔ تم اپنے والدین کو خط لکھتے ہو تو وہ فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ انشا اور املا سب کچھ تمہارا ہے اور صرف تمہارا ہے اور مضمون لکھتے ہو تو والدین تو کیا تم بھی نہیں بتا سکتے کہ تمہارا ہی لکھا ہوا ہے !

زمانہ کے تغیرات نے خطوط نویسی کے بھی اسلوب بدلے ہیں۔ پہلے مدتوں بعد خطوط کے بھیجنے کا سامان ہوتا تھا عرصہ تک لکھے جاتے تھے اور ایک طویل زمانہ کے بعد پہنچتے تھے، خطوط اطمینان سے لکھے جاتے تھے اور شوق سے لکھے جاتے تھے اس لئے ان میں دلکشی ہوتی تھی، موثر ہوتے تھے اور یادگار کے طور پر محفوظ کر لئے جاتے تھے۔ اب وہ باتیں نہیں رہیں۔ پہلے ضرورت ایجاد کی محرک ہوتی تھی، اب ایجاد ضرورتوں کی محرک ہوتی ہے۔ ایجادات نے زندگی کے اسلوب بدلے، بعضوں کا خیال ہے کہ اگر انسان کی مشغولیت اور بدحواسی کا یہی عالم رہا تو آئندہ خطوط صرف

زبانی کھیل رہ جائے گی، لیکن مایوس ہونے کی وجہ نہیں ہے۔ جس طرح اور جن اسباب کے ماتحت طویل قصص یا ناولوں کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی، مجھے یقین ہے خطوط کی نوعیت بھی بدل جائے گی، فرصت کم ہونے کی سبب سے ممکن ہے آئندہ لوگ اپنے تمام خیالات خطوط ہی میں ادا کرنے لگیں۔ اب تک مکتوب کو نصف ملاقات کہتے آئے ہیں، ٹیلی وژن کی ترقی سے ممکن ہے نصف ملاقات ”نصف بہتر“ قسم کی ملاقات پر ختم ہوا کرے اور تماشائی کا مایابی تمنائی بیقرار رہی کو بہت کچھ کم کر دیا کرے۔

خط نویسی کی تاریخ نہایت طول طویل اور دلچسپ ہے۔ یونانی ادب میں خط کا تذکرہ ہومر کی ایلیڈ میں آیا ہے۔ اسکی ابتدا یقیناً بعض مخصوص نشانات سے ہوئی ہوگی، اور اس زمانہ میں عوام اس سے اسی طور پر متحیر یا سراسیمہ ہوئے ہونگے جیسے آجکل کے بعض وحشی قبائل گراموفون وغیرہ قسم کی چیزوں سے ہو سکتے ہیں۔ ملالیان روم میں یہ چیز زیادہ منظم اور مقبول ہوئی، یہاں تک کہ صدی قبل مسیح میں سسرو نے خط نویسی میں جو شہرت حاصل کی اس کے سامنے اب بھی لوگ سرعقیدت خم کرتے ہیں۔ سسرو کے خطوط کو اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ متمدن طبقوں اور مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں صدیوں لاطینی کا دور دورہ رہا۔ اور لاطینی میں سسرو کے خطوط اسلوب خط نویسی کے بہترین نمونہ ہیں۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ تک انگریزوں کی آپس میں لاطینی ہی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ ملٹن اور کرامول کے عہد تک سائنس اور علم سیاست کی زبان بھی لاطینی رہی، چودھویں صدی تک تو انگریزوں کو متحدہ قومیت کا احساس ہوا اور نہ مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریزی دربار پر فرانسیسی زبان کا تسلط رہا۔ یہی نہیں بلکہ بچوں کو ابتدا ہی سے فرنچ بولنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور فرانسیسی جاننا عالی نشی کی دلیل سمجھی جاتی تھی جنگ صد سالہ کے بعد انگریزوں میں روح ملت بیدار ہوئی اور انھوں نے اپنی مادری زبان کو قوم کی زبان قرار دیا۔ انگریزی زبان میں والپول، چسٹر فیلڈ کاؤپر، فٹز جیرلڈ، اسٹونسن، کیٹس اور کارلائل خطوط نویسی کے امام مانے جاتے ہیں۔

اُردو میں بھی خط نویسی کی تاریخ انھیں حالات سے ملتی جلتی ہے، ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی زبان فارسی رہی اور گومغلوں کے آخر دور حکومت میں اُردو رفتہ رفتہ برسر عروج آنے لگی تھی، لوگ عام طور پر اُردو بولنے لگے تھے، شعر و شاعری بھی کافی ترقی کر چکی تھی لیکن فارسی کا تسلط ایک گونہ برقرار ہی رہا۔ دور حاضر میں ابھی کافی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے عہد طفولیت میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور فارسی اور عربی کا جاننا شرافت اور

لے ٹیلی فون میں آواز سنائی دیتی ہے شکل نہیں دکھائی دیتی۔ ٹیلی وژن میں آواز کے ساتھ ساتھ شکل بھی دکھائی دیتی ہے جسکو آواز صوت رساں و شکل نام بھی کہہ سکتے ہیں۔ نیاز صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: ”دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم“۔ ٹیلی وژن کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔

خوش خوقی کی دلیل تھی۔

غالب کو جہاں اور بہت سی باتوں میں نمایاں خصوصیات حاصل ہیں ایک یہ بھی ہے اور کسی سے کم نہیں ہے کہ جس چیز کو انھوں نے اپنے لئے ”ننگ“ قرار دیا تھا اس میں ایسے ”نقشہ ہائے رنگ رنگ“ پیدا کئے جو آج بھی بے مثل ہیں اور خطوط نویسی کے جدید ترین اصول تنقید پر صحیح اترتے ہیں۔ غالب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے خط نویسی کا اولین اور شاید بہترین معیار یہی ہے۔ غالب کے خطوط کا سب سے زبردست راز یہ ہے کہ انھوں نے رقصات میں اپنی سیرت اور اپنے ماحول کی ادنیٰ جزئیات کو بھی اصلی رنگ میں بغیر کسی تصنع یا آمیزش کے پیش کیا ہے اور اس امر کی کہیں کوشش نہیں کی کہ وہ بہترین شاعر، مفکر یا معلم کے رنگ میں نظر آئیں۔ ان کی ظرافت، بذلہ، سنجی، بے تکلفی و سبب المشرقی، شاگردوں سے اُلقت، بڑوں اور بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں پر شفقت، ہر جگہ نمایاں ہے، زمانہ نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور انھوں نے زمانہ کو کس طور پر برتا اس کے بعض نہایت دلنشین نمونے ملتے ہیں اور بحیثیت مجموعی جس چیز نے ان رقصات کو لازوال بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا لکھنے والا غالب اور صرف غالب ہو سکتا تھا!

غالب کے علاوہ اوروں کے مکاتیب بھی شایع ہوئے ہیں، مثلاً سر سید، محسن الملک، امیر، نذیر احمد شبلی، اکبر وغیرہ ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ شبلی کے خطوط ہیں۔ جس چیز کو شبلی نے عطیفی کے نام کے خطوط میں چھپانے کی کوشش کی ہے اس کو بے نقاب کرنا یوں ضروری نہیں ہے، کہ خود نقاب نے جلوؤں کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے ہماری افتاد طبع کچھ ایسی ہے، جس کے حسن یا قبح سے یہاں بحث نہیں ہے، کہ ہم ہر چیز کو اکثر کھینچ تان کر اس معیار اخلاق سے پرکھنا چاہتے ہیں جو اکثر نفس اخلاق سے اتنا تعلق نہیں رکھتا جتنا مخصوص تمدن اور ماحول سے، شبلی کے ان خطوط سے شبلی کے پرستاروں کو نگاہ نیچی کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ خطوط میرے نزدیک یوں قابل احترام ہیں کہ ان میں انسانی جبلت اور شاعرانہ شرافت کو ایک دوسرے سے متوازن رکھا گیا ہے ان خطوط میں تصنع اور تکلف کم اور صداقت شعری پورے طور پر نمایاں ہے۔ ہر حقیقت حسین ہوتی ہے لیکن اکثر حسین نظر نہیں آتی اصلی شاعر صرف وہ ہے جو حقیقت کو حسن کا جامہ پہھا سکے۔ حسن حقیقت، حقیقت حسن سے زیادہ دلکش چیز ہے ایک کا بے نقاب کرنا شاعر کا کام ہے اور دوسرے کی تحلیل و تجزیہ فلسفیوں کی بر توفیقی ہے!

سر سید، محسن الملک، نذیر احمد کے خطوط کو پراسیوٹ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے ان خطوط کو اپنی نج کی زندگی کا آئینہ دار نہیں بننے دیا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کے خطوط کو یہاں ہم وہ حیثیت نہیں دینا چاہتے، جس کو ہم نے شروع سے و نظر رکھا ہے، اکبر کے خطوط میں یہ صفت ضرور ہے کہ ان میں وہ اکثر اپنے خاص رنگ اور مخصوص حال میں نظر آئے ہیں۔ لیکن یہ خطوط بالعموم اس زمانے کے ہیں جب

گئے خندہ اوچ تیغ اسیلے

کے بجائے۔ گئے گریو اوچ ابو بہارے۔ — زیادہ صادق آتا ہے۔

اب نیاز صاحب کے کتوبات کی باری آتی ہے۔ نیاز صاحب بڑے گھاگھ ہیں۔ پہلے ہی پیرے میں انھوں نے میرے ان تمام خطرات کا سد باب کرنا چاہا ہے جن کا اظہار میں نے ان اوراق کے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔ نیاز صاحب سے میرے بڑے پُرانے ذاتی اور گہرے تعلقات ہیں۔ بہت زمانہ ہوا اس طرحی ہال کے سامنے ملاقات ہوئی، میں ہال کے اندر تھا چیرا سی نے کہا ایک صاحب بلاتے ہیں، میں نکلا تو نیاز صاحب نظر آئے۔ اس سے پہلے صرف غائبانہ تعارف تھا، اور معلوم ہوتا ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے مرعوب تھے لیکن ملاقات کا فوری انجام یہ ہوا کہ دونوں کا ایک دوسرے پر سے رعب زائل ہو گیا جس کا دونوں کو اب تک افسوس ہے۔

دو تین سال بعد ایک شام کو جو باوجود اس کے کہ عورتوں کا مجمع تھا اور موسم اعتدال پر تھا، قطعاً قاتل نہ تھی، نور الرحمن صاحب کی معیت میں نیاز صاحب سے دوسری ملاقات نمائش میں ہوئی، مٹے یہ پایا کہ تھیر دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم تینوں تاشا گاہ پہنچے۔ جگہ کچھ ایسی ملی تھی کہ جہاں سوا مونگ پھلی کھانے کے اور کوئی موقع ہی نہ تھا، نیاز صاحب نے ارٹ کی کچھ فضا بھی پیدا کر فی چاہی لیکن فوراً پردہ اٹھنے کا اعلان ہوا، اور بادشاہ صاحب گاتے ہوئے نظر آئے ہاتھ میں ابرک کا ایک رنگین گلاس، پاؤں میں روپ سول کا میلا سا جوتا! ابھی ہم سب سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بادشاہ صاحب نے ایک لمبے، بلند اور بھرپور سر کے عین وسط میں اس زور سے گلا صاف کیا کہ ہم تینوں دہل گئے اور قریب تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کی زبان سے کوئی اضطراری فقرہ برآمد ہوتا کہ مردود نے سہیلیوں کے ساتھ چٹکی بجانی شروع کر دی اور ہم تینوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے!

یہ وہ زمانہ تھا جب نگار بھوپال سے نکلتا تھا اور نیاز صاحب کے ذہن و دماغ میں نگارستان کی کارفرمائی تھی خوب خوب چیزیں نکل رہی تھیں اور مجھے بڑی مسرت تھی کہ اردو میں ایک خوشگوار اسلوب کی طرح پڑ رہی تھی۔ یلدرم نے جس چیز کو حسین اور دلکش بنا دیا تھا، نیاز نے اس میں وزن اور گہرائی پیدا کر دی تھی۔ بعض بعض چیزیں دماغ کے رنگ سے گزر کر دماغ کے ”دھبوں“ سے ضرور جا ملی تھیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی فضا میں رنگ یا آہنگ کا کہیں اختلال نہ تھا۔ اسی دوران میں آگرہ سے نقاد نکلا اور مجھے محسوس ہوا کہ تیرکمان سے نکل چکا ہے اور وہ دن دو دن نہیں جب ادب لطیف ادبی ادب باشی کا مترادف بن جائے گا، ایسا ہی ہوا۔ شایبیاں اور ٹیگوری نے اردو کی فضا ایسی مسموم اور متعفن کر دی کہ مجھے رہ رہ کر اردو کا وہ زمانہ یاد آنے لگا جس کو متعین کرنا آسان ہے لیکن جس کے اظہار میں سراسر زبان ہے۔ نیاز صاحب کی ہمت ہو تو فٹ نوٹ میں میری ذمہ داری پر اس کا اظہار کر سکتے ہیں!

ادب لطیف جس کے امام یلدرم اور نیاز صاحب تھے بازاری لوگوں کے ہاتھوں سنخ ہوا جو یقیناً کم مایہ نا تجربہ کار

اور نامعقول تھے اور جلد سے جلد کسی قیمت پر سستی سے سستی شہرت حاصل کرنے کے بھوکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے رسالے نکلنے لگے اور ان میں خرافات کو وہ فروغ دیا گیا کہ شریفوں پر دنیا تنگ ہو گئی۔

یہ دم اپنی جگہ پر قائم رہے ان کو اپنی شاعرانہ پرواز کے لئے ترکی ادب کی وسیع اور صلاح فضا پہلے سے میسر تھی، نیاز رقاصہ کی بزم تک پہنچ چکے تھے کہ ناگزیر کمین

”عالم آشوب نکاہے سر را ہم بگرفت“

نیاز صاحب لکھنؤ پہنچے اور لکھنؤ والوں سے ٹکری ہوئی۔ ایک طرف نیاز صاحب تھے دوسری طرف لکھنؤ کا تمدن وہاں کی معاشرت، وہاں کے لوگ، وہاں کی روایات، اور وہاں کی شعر و شاعری۔ یہ حالات و حوادث بجائے خود کیا کم تھے اور نیاز صاحب میں کیا کچھ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے تھے کہ مولانا مآجد صاحب نے اسلام کو خطرہ میں پا کر مسلمانوں کو صفِ جہاد میں آجانے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ مولانا مآجد صاحب فتحیاب رہے، نیاز صاحب کو زک ہوئی اور اسلام جہاں کا تھاں رہا!

ان واقعات سے نیاز صاحب کا ذہن و دماغ غیر شعوری طور پر متاثر ہوا۔ اب ان کی تحریروں میں وہ تنگنگی، رنگینی اور ”جذبہ بے اختیار شوق“ نہیں پایا جاتا جو نگارستان کی جان ہے۔ اب کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور سوسائٹی سے بیزار ہیں۔ ان کی تحریروں میں بیزاری، زہرناکی اور انتقام کی لہریں ملتی ہیں اور یہ حقیقت حال بجائے خود اس درجہ روح فرسا ہے کہ اس سے پناہ لینے کی خاطر ان کو شراب و شاہد جیسی سستی اور گریز پالذتوں میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ پناہ لینے کے معنی یہاں کام و ذہن کی لذت یا بی نہیں بلکہ وہ ذہن کی زہرناکی کو کبھی شاہد و شراب کی حکایت لطیف سے تسکین دینا چاہتے ہیں اور کبھی زندگی کے بعض نازک، عمیق یا پیچیدہ مسائل سے تنگ و ترش ہو کر نظام حیات و معاشرت کو یکسر اس مشتبہ اخلاقیات کے ورطہ میں ڈھکیل دینا چاہتے ہیں جس کو عرف عام میں لاندہبی، التذاذیت یا اشتراکیت وغیرہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ذہنی میلان موجودہ دنیا کا سب سے بڑا انکشاف یا سرمایہ ذہنی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی مذہب اخلاق یا سوسائٹی کے دیرینہ تصور سے یکسر بغاوت کر دیا جائے اور ہر کس (و نا کس) سوچنے ہی پر آزاد نہ ہو بلکہ اپنی سوچی ہوئی چیز کو قطعاً صحیح یا حق بجانب سمجھنے اور آزادی سے برتنے میں بھی آزاد ہو۔ ہر شخص کو ہمیشہ سوچنے اور سمجھنے کی آزادی رہی ہے یہ نعمت کچھ آج ہی کی دریافت کی ہوئی نہیں ہے۔ البتہ جو چیز آج کی ہے وہ یہ کہ ہر شخص جو کچھ سوچتا ہے وہ صحیح اور صالح بھی ہے اور دوسری چیزیں صحیح اور صالح اس لئے نہیں ہیں کہ وہ دوسرے کی سوچا اور برتی ہوئی ہیں!

اصل یہ ہے کہ مادی ذرائع اور وسائل کی ترقی سے آجکل زندگی اس درجہ تیز و تند ہو گئی ہے کہ ہم اس کا مداوا صرف مفرحات یا محرکات سے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ باقاعدہ علاج کی فرصت ہی باقی نہ رہی۔ اب

زندگی عزیز نہیں رہی بلکہ زندگی کے لذائذ عزیز رہ گئے ہیں۔ استقامت کا احترام نہیں ڈگریاں مقصود بالذات ہو گئیں! نیاز صاحب میری اس فرسودہ منشی پر کیا کچھ ہیں مجھیں نہ ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کجا مطربی و مسخرگی اور کجا یہ قل اعوذت لیکن کیا کیا جائے جب معلم و مصلح مطربی و مسخرگی اختیار کر لے تو بیچارہ مطرب و مسخرہ کیا کرے۔

نیاز صاحب سے میں یہ کہوں گا کہ بوڑھوں کو درگور سمجھئے لیکن رزم حیات میں نوجوانوں کو صرف صفت آرا اور سینہ سپر ہونے کی دعوت دیجئے۔ نوجوانوں کے سامنے بڑی بڑی گتھیاں ہیں جو ہمارے آپ کے آبا و اجداد کے سامنے بھی غالباً نہیں آئی تھیں۔ ان کو غیر ذمہ دارانہ فقرے یا شعر، شراب و شباب کی سرمستیوں کی طرف اشارہ کر کے اپنی ذمہ داری نہ بھولنے اور نہ ان نوجوانوں کو بوالہوسی یا سہل انکاری پر آمادہ ہونے دیجئے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی مسئلہ یا معاملہ پر خود متیقن نہیں ہوتے یا اس کا صحیح محل سمجھنے سے معذور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں طالب یا تثنہ کو غیر ذمہ دارانہ بشارتوں یا غفلت زرا طرب انگیزیوں کی طرف متوجہ یا مائل کر دینا قطعاً غیر صالح فعل ہوتا ہے۔ اسی کو ”عطاسیت“ کہتے ہیں۔ نوجوانوں کو امتحان سے عہدہ برآمد ہونے کی دعوت دینی چاہئے، نتائج کی مشکلات یا مسکرات سے کیوں دھمکایا یا پرچایا جائے! نیاز صاحب! امید ہے میرے ان خیالات سے آزرہ نہ ہوں گے۔ میں مجبور ہوں لیکن کیا کروں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جن سے ہماری بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں، مصیبت کا علاج مسکرات سے کرنے لگے ہیں۔ ابھی ابھی قاضی عبدالغفار صاحب (صاحب نقش فرنگ) کی دو تصانیف نظر سے گزریں۔ یسلی کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری نقش فرنگ کے مطالعہ کے بعد میں قاضی صاحب کی شخصیت اور ادب طرازی دونوں کا معترف ہو گیا تھا۔ یسلی کے خطوط دیکھ کر ادب طرازی کا اب بھی قائل ہوں، لیکن مجنوں کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے اختیار آہ نکلی کہ

از قبیلہ مجنوں کے ناند!

قاضی صاحب نے بھی نوجوانوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہے جس کی ان کی سیرت و شخصیت سے توقع تھی۔

ہاں اہل طلب کون سے طعنہ نایافت

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو کوئی ذمہ دارانہ طریق کار نہیں ہے۔ نوجوانوں کو ”جوانی دیوانی“ کا سبق پڑھانا سہل ضرور ہے لیکن قطعاً ”نافرجام“ ہے۔ یہی چیز عبرت خیز اور مضحکہ انگیز بھی ہو جاتی ہے جب یہ سبق ہم بوڑھے پڑھانے لگتے ہیں میرا ذاتی خیال ہے کہ ہماری اس حرکت پر نوجوان لعنت تو خیر نہیں بھیجیں گے، کیونکہ نوجوان نہ مایوس ہوتا ہو اور نہ مریض، لیکن وہ ہنسنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتے۔

مکتوبات نیاز میں ہر نوع کے خطوط ملتے ہیں جن میں نیاز صاحب نے اپنے مخصوص طرز انشاء میں زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً عشق و عاشقی، رندی و ہوسناکی، شعر، شاعری یا افسانہ، مذہب، اشعار، اشعار

تصاویر، ماتم پرسی، بیوی اور شوہر کے مناقشات، شادی سے اجتناب، بچوں کے ہوتے ہوئے باپ کو دوسری شادی نہ کرنے کی ترغیب، سانحہ کی اطلاع، مشرقی علم و ادب، غرض ایک پڑھے لکھے خوش مزاج انسان کو بالعموم جو امور زندگی میں پیش آتے ہیں، ان سب پر تنقید کی گئی ہے۔

ان خطوط میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نیاز صاحب نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے خطوط لکھے ہیں وہ نیاز صاحب ہی کے برابر لکھے پڑھے یا صاحب ذوق ہیں۔ دوسرے یہ کہ نیاز صاحب نے مکتوب الیہ کے انتخاب میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اس زمرہ میں وہ لوگ نہ آنے پائیں جن کو نیاز صاحب سے سب سے قریب ہونا چاہئے تھا، مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹی، بیٹا، بیوی، ملازمین یا مہلکین تعجب ہے کہ ان کا سابقہ دوسروں کے رشتہ داروں سے ایسا پڑا کہ وہ اپنے رشتہ و ہمدوں کو فراموش کر گئے! بعض خطوط میں یہ دریافت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کی جنس کیا ہے اور نیاز صاحب سے ان کے تعلقات کیسے ہیں خطوط کا لب و لہجہ یا اسلوب نگارش بالعموم عاشقانہ، شاعرانہ یا زندانہ ہے، طعن و طنز کا عنصر بھی کچھ کم نہیں ہے، لیکن ان سب پر فوق، وہ پندار تفوق ہے جس کو نیاز صاحب کہیں ہاتھ سے نہیں دیتے۔

نیاز صاحب کے موجودہ اسلوب انشا کی مثال ایک طور پر انگریزی کے مشہور طنزی شاعر جو ناٹھن سوکفٹ کے ہاں ملتی ہے۔ سوکفٹ بھی دنیا اور انسانوں سے بیزار تھا، نظام حیات میں اس کو بھی کہیں شگفتگی نظر نہیں آتی تھی، تلخی اور زہرناکی اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھے، تاہم اس نے اپنی محبوبہ اسٹیل کو جو خطوط لکھے ہیں وہ سادگی الفاظ اور سادگی خیال کے بہترین نمونے خیال کئے جاتے ہیں۔ اسٹیل ایک غریب خاندان کی بہت کم پڑھی لکھی لڑکی تھی سوکفٹ نے اس کو دو تہا فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں (جنرل ٹو اسٹیل) ان میں اپنے جذبات، شیفٹنگی کو سہل سے سہل الفاظ اور چھوٹے سے چھوٹے فقرہ میں ادا کئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی سخت و سنگین یا زہریں بھیا ہو کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی نرم و نازک جذبات کا اسیر نظر آئے گا اور پرائیوٹ لایٹ یا پرائیوٹ خطوط اس کے بہترین ترجمان ہیں۔ اس بنا پر نیاز صاحب کے خطوط یا تو پرائیوٹ نہیں ہیں یا نرم و نازک جذبات کی ان پر کار فرمائی نہیں ہے یا پھر جو مال اچھا تھا، وہ الگ باندھ کے رکھا ہے۔

اب میں بعض خطوط کا سرسری جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے صرف ایسے خطوط کا انتخاب کیا ہے جن سے صاحب مکتوبات کے طبعی میلان یا مخصوص طرز انشا پر روشنی پڑتی ہے مثلاً:-

مکتوب نمبر ۵۳ یہ خط نواب صاحب کو لکھا گیا ہے۔ نواب صاحب عازم حج ہیں۔ برسیل تذکرہ انھوں نے فرمایا کیا نیاز ساتھ ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اس پر نیاز صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جسکے جستہ جستہ اقتباسات حسب ذیل ہیں

لے امیر کی ذمہ داری پر نیاز صاحب پورا سفر نقل فرما سکتے ہیں!!

(۱) آپ چلیں گے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور یہاں عالم ہوگا "نظارہ زنجبیدنِ مژگاں گلہ دارد"

(۲) آپ کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح و حائل ہوگی اور یہاں جام دینا۔

(۳) ممکن ہے کسی صورت کو دیکھ کر بے اختیار میری زبان سے سبحان اللہ نکلے اور آپ تسبیح یا استغفر اللہ سے رجوع کریں۔

(۴) میرے لئے آپ جارجیا کی کوئی حسین کنیز لیتے آئیے گا اور یہ نہ ممکن ہو تو خیر اس کی تصویر ہی سہی لیکن خاک شفا

اور زمزم کے پانی سے اسے ملحدہ ہی رکھئے گا، ورنہ ممکن ہے خواب ہو جائے۔

اس خط کے مطالعہ سے بذاتہ میں نے یہ اندازہ لگایا کہ نیاز صاحب نے اس مسئلہ کو چھڑا ہی اس لئے کہ اس کو ہدف

ملامت بنائیں۔ اول تو نیاز صاحب کے خیالات معلوم ہوتے ہوئے نواب صاحب کی یہ خواہش کہ نیاز صاحب حج میں ساتھ

چلیں کچھ بے کمی سی معلوم ہوتی ہے، بالفرض نواب صاحب نے ازراہ لطف و محبت یہ خواہش ظاہر بھی کی تو نیاز صاحب

زیادہ سے زیادہ اس کو معذور قرار دے سکتے تھے نہ یہ کہ بعض ایسے خیالات کا اظہار کرتے جن سے ان کے دوست یا مخدوم

کی دشمنی قصی تھی پھر یہ بھی ہے کہ اب تک حج وغیرہ کے سلسلہ میں شعرا یا زندوں نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے

ان میں زہد رانی، تنگ نظری، استعارۂ شراب وغیرہ کا ذکر تو آیا ہے لیکن ایک پرائیوٹ خط میں کسی شخص نے آج تک کسی

عازم حج سے جارجیا کی کنیز کی فرمائش نہیں کی۔ علاوہ بریں اگر لطف داستان کے سلسلہ میں ان خیالات کا اظہار

ناگزیر تھا تو بھی اس خط کے مکتوب الیہ نواب صاحب براہ راست نہیں ہو سکتے تھے اس کے جواز کی صورت صرف یہ

ہو سکتی تھی کہ نیاز صاحب کسی دوسرے دوست کو خط لکھتے اور ضمناً نواب صاحب کے حج اور جارجیا کی کنیز کا تذکرہ کر دیتے۔

مکتوب نمبر ۷۷۔ یہ خط ایک حادثہ کا مظہر ہے۔ مجھے ایک مکرّم نے بتایا کہ غالباً نیاز صاحب نے یہ خط اپنے جگر گوشہ کی دفاتر

پر لکھا ہے لیکن کسی کو اس دردناک حادثہ کی خبر نہ ہو تو وہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ خط کس سے متعلق ہے اور نیاز صاحب کے

اُس سے کیسے تعلقات ہیں۔ الفاظ میں جوش و خروش، زور و استوار ہی سب کچھ ہے، فقرہ اور ترکیبیں باہر گر خست

اور پیوست ہیں۔ انشاء و عبارت ادیبانہ ہے لیکن یہ چیزیں اس درجہ نمایاں ہیں کہ اکثر محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی چیزیں مقصود الذات

مکتوب نمبر ۹۰۔ یہ خط نیاز صاحب ہی کے پیش کردہ ایک شعر کی تفسیر ہے،

بیا کہ ردنق یک کارخانہ کم نہ شود

ز زہد ہم چو تویی یا ز فسق ہم چو منی

اور نیاز صاحب کے عین اُس رنگ میں جس کے خلاف میں نے انھیں اوراق میں احتجاج کیا ہو۔ اسلئے مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے

مکتوب نمبر ۶۵۔ سب سے بڑا اور سب سے دلچسپ خط نہیں ایک مختصر افسانہ ہے۔ دلنشین ظرافت کا نہایت عجیدہ

زنگین اور شگفتہ نمونہ۔ نیاز صاحب اس خط پر فخر کر سکتے ہیں۔ مجھے رشک ہے کہ یہ چیز مجھے کیوں نہ سوجھی۔ نیاز صاحب میں

درخواست کر رہا تھا کہ اس قسم کا کوئی اور واقعہ کبھی پیش آئے تو مجھے ضرور "یاد و شاد فرماتے رہیں گے"

مکتوب نمبر ۱۲۵ - اس خط کی جان کرانا کا تبین کی شادی ہے۔ میں اس خط کو بھی نیاز صاحب کا کارنامہ سمجھتا ہوں
گو آخر میں تھوڑے سے بدخط ہو گئے ہیں، لیکن کوئی مضائقہ نہیں، کرانا کا تبین معاف فرمائیں گے۔
مکتوب نمبر ۲۴ - اس خط کا پہلا شعر ان تمام اشعار پر بھاری ہے جو نیاز صاحب نے مولانا ابوالکلام کی مانند اپنی مکتوبات
میں ہر طرف بکھیر رکھے ہیں۔ کیا کہنے ہیں۔

بے دیکھے کہہ دیا کہ چنے ہم نہ کھائیں گے

کچے کہاں ہیں یار، اُبالے ہوئے تو ہیں

مجھے خود اپنا بچپن یاد آگیا۔ میرے معلم اول ایک "منشی جی" تھے۔ دوالی کے موقع پر (بہ مناسبت عیدی) ایک
دوالی، کہہ کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ اپنے قبلہ کا ہی صاحب کو دینا، شعر تھا:-

دوالی آمدہ ایام اعلیٰ

چراغوں جل رہے ہیں زیر دبالا

اس خط میں نیاز صاحب نے اپنی طفولیت کا زمانہ یاد کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن عہد طفلی کی جن جن چیزوں کا
ذکر کیا ہے وہ اپنے ہم عمر ساتھی (یا بقول میرے منشی جی کے، طفل سے) نہیں وابستہ کج باتیں۔ قصہ سننے کے بچے بڑے آرزو مند
ہوتے ہیں لیکن چاند میں بڑھیا کا چہرہ کا تنہا یاد دہو، پری، طلسمات، توہمات یا شہزادے شہزادیوں کی کہانیاں بچے ایک دوسرے
سے نہیں کہا کرتے بلکہ گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو سنایا کرتی ہیں۔ شام کو دریا کے کنارے، یعنی طور پر بیٹھے رہنا بھی بچوں کا
کوئی محبوب مشغلہ نہیں ہے، البتہ چوری چھپے امرود توڑ کر کھانا اور آنکھ مچولا کھیلنا طفلانہ مشغلوں میں آتا ہے جس کا تذکرہ نیاز
صاحب نے کیا ہے۔ لیکن یہ باتیں بچوں کے ساتھ اس درجہ مخصوص کر دی گئی ہیں کہ ان میں کوئی ندرت باقی نہیں رہی۔ یہ بخیر
مولانا شاد الخیر کے ناولوں کا پلاٹ ہے یعنی وہی بیوہ، سوکن، یتیم، نمونیہ، دق اور رات کے وقت جب کڑا کے کی سردی
پڑتی ہو صحن میں کھڑے ہو کر دعائیں مانگنا وغیرہ ہر شخص کا بچپن اور بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ لطائف و ظرائف مختلف
اور مخصوص ہوتے ہیں۔ پرائیوٹ خط میں ان کا تذکرہ یقیناً پر لطف ہوتا۔

ناظرین - میں نے غلطی کی کہ یہ مضمون لکھ مارا، دوسری غلطی نیاز صاحب کریں گے اگر اسے شایع کر دیں گے
اور تیسری اور یقیناً سب سے بڑی غلطی آپ کریں گے اگر اسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیں گے۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت
ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ آپ مکتوبات نمبر ۱۸ - ۷۹ - ۱۰۱ - ۱۱۹ - اور ۱۳۱ کا مطالعہ کریں اور مجھے اور نیاز صاحب دونوں
کو بخش دیں۔
تا بہم شد خداے بخشندہ !

رشید احمد صدیقی

جہاز چلنے لگے، گھر گھر ٹیلیفون کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ موٹروں کی افراط، مشینوں کی روز افزوں کثرت، لانتہا خرید و فروخت، وہ جادو کی چھڑی جس نے یہ انقلاب پیدا کیا، مشین کا نظام تھا، جس کی وجہ سے بے حد شمار ”اسی طاقت“ انسان کی مٹھی میں آگئی۔ اس ”طاقت“ کے کرتے ہر طرف نظر آنے لگے۔ ۱۸۷۰ء میں دنیا نے ہ کروڑ ٹن گیہوں کی فصل کاٹی تھی، ۲۰ سال بعد ۱۹۳۰ء میں یہ فصل ۳ کروڑ ٹن ہو گئی! قابل صرف چیزوں کی تعداد دن دوئی، رات چوگنی ہونے لگی، موٹر سائیکلیں، اشتہار بازی، بجلی کی روشنی، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، زہریلی گیسیں، نقلی گھی، مصنوعی قہوہ، نقلی سونا، مصنوعی چمچا، مصنوعی تعلیم، یہ سب کچھ مہیا ہو گیا۔ لانتہا خوشحالی! بے پایاں فراغت!!

اس جگہ ہمیں سیاسیات سے بحث نہیں، لیکن برسبیل تذکرہ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ دولت آفرینی اور تجارت کی اس گرم بازاری نے متعدد سیاسی، معاشی نظام پیدا کر دیے۔ سارا صنعتی یورپ، اپنے کروڑوں باشندوں کے ساتھ ایک عظیم الشان شہر بن گیا، شہر والوں نے گاؤں والوں کو مہذب بنانے کا بیڑا اٹھایا، نوآبادیاں بنیں تجارت پھیلی، خوش حالوں نے بد حالوں کو قرضے دئے اور اتنے قرضے دئے کہ دنیا قرض خواہ اور قرضدار قوموں میں بٹ گئی، اور ”بین الاقوامی“ مالیاتی سرمایہ جس کی باگ ڈور گنتی کے چند بنکوں کے ہاتھ میں تھی، ہوا کے پروں اور بجلی کی لہروں پر اڑ کر مخلوق کی دستگیری کے لئے پہونچنے لگا۔ اور شہنشاہیت کا خاتمہ کرنے والے، حریت کے علم برداروں نے ایک نئی شہنشاہیت کا جس کا نام ہے اصل شاہی!

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، یہ مضمون سیاسیات سے متعلق نہیں ہے، بلکہ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ”مشینی نظام“ کی رشمہ آفرینیوں نے معاشرہ کا چولا کس طرح بدلا، پرانی ہیئت اجتماعی میں کیا کاٹ چھانٹ کی، ذہنوں میں کیا بات پیدا کئے، اور انسانیت کو ”ترقی“ کا یہ سودا گراں پڑایا ارزاں۔

پچھلی صدی میں بغیر کسی سیاسی شور و شغب کے، صدیوں کا پرانا، آزمایا ہوا، معاشرتی ڈھچر، زمین پر آ رہا اور جس میں انسان نے آرام و سکون کی زندگی بسر کی تھی، انھیں چھوڑ کر اب اُس نے میدانوں کا رخ کیا یا کارخانوں کے کوسے دروازوں نے اسے نکل لیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک یورپی انسان کی زندگی چند با فراغت حلقوں میں عزت کے ساتھ بسر ہوتی تھی ان میں سب سے زیادہ اہم حلقہ قصبہ تھا، اور دیہی محنت یا گھریلو اجتماعات مشین نے اپنی پوری ”اسی طاقت“ کے ساتھ ان بنیادوں پر ضرب لگائی، گھریلو صنعتوں کی بربادی نے وجہ معاش کو کم کر دیا۔ زراعت پیشہ طبقہ اپنا پیشہ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ شہروں میں پنچایتوں کی حمایت میں رہ کر دستکار ایک حد تک اطمینان کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ پنچایتیں، زبردست سرمایہ دار نظامات کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں اور پیشہ ور دستکار بے یار و مددگار

رہ گئے۔ سیکڑوں کام جو اطمینان کے ساتھ گھر کی چار دیواریوں میں ہوتے تھے، جیسے سلائی، کشیدہ کاری، کفش سازی اور پارچہ بانی اور جن میں گھر والیاں بھی برابر کی حصہ دار ہوتی تھیں اور سارا خاندان محنت مشقت کر کے زندگی بسر کرتا تھا، رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ گھر کے کرنے کے کام ”بازاروں“ میں ہونے لگے، اور گھر والیوں کے لئے صرف یہی صورت رہ گئی کہ یا تو وہ بھی ”بازار“ میں جا کر زندگی کی تنگ و دو میں مصروف ہوں، یا گھروں میں بیکا رہیں۔ معاشرہ کی جو طبقہ بندی صدیوں سے چلی آرہی تھی وہ متزلزل ہو گئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آبادی کنبوں اور طبقوں کی بجائے افراد پر مشتمل ہو گئی، جو پرکاش کی طرح انقلاب کی آندھی میں ادھر ادھر منتشر ہو کر بڑے شہروں اور صنعتی علاقوں میں بغیر کسی ربط باہمی اور شیرازہ بندی کے ڈھیر ہو گئے۔ قصباتی آبادی کا اس طرح شہری بنایا جانا ہمارے زمانہ کی خاص خصوصیت ہے۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ لاتعداد مخلوق شہروں میں کیا کرتی ہے تو آپ کو چاہئے کہ بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی و اقتصادی مرکوزوں پر ایک نظر ڈال لیں۔ وہاں آپ کو یہ لوگ کام کرتے نظر آئیں گے اور اب ان کا نام ”پرولتاریہ“ یا ”مزدور پیشہ طبقہ“ یا صرف ”مزدور“ ہے اور آج کل ہمارے اکثر معاشری مسائل میں ان سے بحث کی جاتی ہے۔

اگر آپ موجودہ حیات اجتماعی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس معاشی دور نے افراد کی اس ابتری میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی زندگی میں کامیابی کا معیار آج کل ایک اور صرف ایک ہو گیا ہے دولت، بشکل زر، اور اب عزت، ذریعہ آمدنی سے ناپی جاتی ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی دولت سے عزت حاصل ہوتی، لیکن ساتھ ہی کچھ اور صفات بھی شمار کے قابل سمجھی جاتی تھیں۔ اب حسن، قوت، نیکی، عقلمندی، ہنر، خانہ داری ان سب کی ایک ہی کسوٹی ہے، اور وہ یہ کہ کیا ان سے دولت ہاتھ آسکتی ہے؟ اب ایک بالکمال شاعر، مصنف، اور طبیب کو اپنا کمال ثابت کرنے کے لئے انکم ٹیکس کا تختہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس دور میں دولت کی دو صورتیں اس کا ماخذ ہے۔ پرانے زمانے میں ہر قسم کی دولت کا ماخذ سیاسی ہوتا تھا۔ قوت سے دولت حاصل ہوتی اب دولت سے قوت حاصل ہوتی ہے اور دولت کا ماخذ معاشی ہو گیا ہے۔ اب معاشرہ کا طبقہ اعلیٰ یا طبقات معاشی قابلیت کی بنا پر وجود میں آتا ہے۔ اب معاشیات کے نمائندے، یعنی کاروباری طبقہ، انتظام مملکت میں پیش پیش ہیں۔

جدید معاشرہ میں، کاروباری طبقہ کے مخالف اگر کچھ ہیں تو وہ صرف بڑے شہروں کے عوام الناس جن کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں لیکن ہر چیز کی ملکیت کے دعویدار ہیں اور وہ خود بھی اسی معاشی دور کی پیداوار ہیں۔ دولت کے اضافے اور ”تعلیم“ کی ترقی نے ان کو اب اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے ”جائز حقوق“ کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ سیاسیات میں ان کا دخل روز افزوں ہے۔ ان کی بلند آہنگیوں

نے ”پارلیمانی نظام“ پیدا کر دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اب مملکت کی قوت مختلف معاشی اغراض کا گیندوھر کا بن گئی ہے۔ اس معاشی دور میں جمہوریت کے معنی ”ملی بھگت“ کے ہیں۔

معاشرہ پر مشینی نظام کا اہم ترین اثر انسانوں کی ذہنی زندگی پر آ رہا ہے۔ انسان فخر کے ساتھ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے، اسے ہر طرف تہذیب ذہنی کے لاتعداد آثار نظر آتے ہیں، کاغذ کی پیداوار کچھلی صدی میں ۱۶۰۰ گنا زیادہ ہو گئی ہے، روزانہ ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ جس طرح پانی، بجلی اور گیس کی تقسیم کے نئے نئے طریقے پیدا کئے ہیں، اسی طرح سے اشاعت تہذیب کے ذرائع بھی بڑھ گئے ہیں۔ سرکاری مدارس، سرکاری کتب خانے سرکاری نمائشیں، سینما، تھیٹر، ریڈیو سب انسان کو تہذیب بنانے میں مصروف ہیں۔ کیا یہ سب ترقی کی علامتیں نہیں ہیں؟ کیا بنی نوع انسان اس ثقافتی ترقی پر اپنے آپ کو مبارکباد بھی نہ دے!

لیکن تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس حیرت آفریں اور وسیع ذہنی ثقافت کی بنیاد ایک خاص قسم کی مادی تہذیب پر قائم ہے اور وہ بھی اس معنی میں ایک معاشی پیداوار ہے جس معنی میں تجارت، قدیم زمانہ میں بڑے بڑے علماء و فلاسفہ کو بھی اپنی بسر اوقات کے لئے کچھ نہ کچھ دھندا کرنا پڑتا تھا، اور اس طرح تخلیقی ذہانت پر ایک طرح کی بندش عاید تھی، لیکن اب اضافہ دولت کی وجہ سے اشاعت تہذیب کی مقدار و رفتار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اب دن رات کے ہر گھنٹہ میں ناشرین، طابعین، سینما اور تھیٹر کے مالک ذرائع تہذیب کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ لیکن کیا کتابوں کی بہت بڑی تعداد صرف اس لئے تیار نہیں کی جاتی کہ بڑے بڑے چھاپے خانے بیکار نہ رہیں؟

جس ثقافت کی بنیاد کاروباری ہو، اس پر موجودہ مشینی دور کا اثر انداز ہونا یقینی ہے! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ثقافت میں فرد کی حیثیت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ ثقافتی پیداوار کے بوجھ کے نیچے دب گیا ہے، اور یہ دولت پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں دونوں پر صادق آتا ہے۔ مثلاً علم کے پیدا کرنے والے (یعنی عالم) کی کمر آج کل علم کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہے۔ اب وہ پناہ لینے کے لئے تنگ سے تنگ تر کونے ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اپنے لئے ”خصوصی“ میدان تلاش کرتا ہے اس لئے کہ اب وہ کائناتی نقطہ نظر کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ غیر معروف کامین فن کی جو کثرت آج ہے وہ شاید ہی پہلے کبھی ہوئی ہو اور یہ سب ناقدری زمانہ کے شاکلی ہیں۔ سب کو اپنی اپنی جگہ جدت و ندرت کا دعویٰ ہے، لیکن دراصل وہ ایک دوسرے کے نقال ہیں۔

پھر ثقافتی پیداوار کی اس کثرت نے علم کے معیار کو پست کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد کی بہت بڑی تعداد اپنے اپنے الگ کونے میں کام کرے گی تو معیار ضرور پست ہوگا، لیکن دوسری طرف اوسط دماغوں کی خاطر سے بھی یہ معیار پست کر دیا گیا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب امریکہ میں ۴۰۰ پروفیسر عمرانیات پر کتابیں لکھتے ہوں تو عمرانیات سوائے مواد اور معلومات جمع کرنے کے اور کیا رہ جاتی ہے؟

مقدار و معیار کے علاوہ اس معاشی دور نے ذہنی ثقافت کے موضوعوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ اب تہذیب کی شکلیں ہی دوسری ہیں، اور ان کے متعلق نقطہ نظر بھی بدل گیا ہے۔ فلسفہ کی ہمہ گیر حیثیت ختم کر دی گئی ہے اور اس کی جگہ علیحدہ علیحدہ علوم نے لے لی ہے۔ سائنس کی بھی صرف وہی قسم ترقی کے قابل سمجھی جاتی ہے جو علوم طبیعی کی مدرسے مادی ثقافت کے نشوونامیں مردے۔ اب انسان ”زمانہ حال“ کا اسیر ہے۔ اسے اتنی مہلت نہیں کہ نظم و ربط کائنات پر غور کرے۔ وہ اب صرف فطرت کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر تصرف کیونکر حاصل کیا جائے۔ اسکی فکر و نظر کی بلندی اب صرف یہ ہے کہ ہوا سے نائٹروجن کیونکر نکالا جائے اور ہوائی جہاز کس طرح بنائے جائیں!

کاروباری تقسیم عمل کا اصول اب علم کی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح صنعت میں اس اصول نے دستکار کو صرف مشین کا دستہ گھمانے والا بنادیا، اسی طرح مادی وسائل و آلات کی کثرت سے اب عالم بھی فیکٹری کا مزدور بن چکا ہے۔

اور ستم بالائے ستم یہ کہ علوم طبیعی کے مقاصد اور طریقے علوم ذہنی میں بھی استعمال ہونے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادی قدر (Value) روحانی قدر پر غالب آگئی۔ مثلاً آجکل کسی نفسیاتی ناول کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے گویا آپ طلباء کی نفسیاتی مشقوں کو پڑھ رہے ہیں اور تھیٹر میں مادی ساز و سامان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ بجائے فن لطیف کے ’کارگیری‘ بن کر رہ گیا ہے اب غور کیجئے کہ اس تمام انقلاب میں افراد انسانی پر کیا گزری؟ گزشتہ صدی نے ان سے کیا چھینا، اور اس کی بجائے کیا دیا؟

سب سے کاری ضرب جو مشین نے انسانیت پر لگائی یہ ہے کہ اس کی دنیاوی زندگی کا رشتہ ہر قسم کے مادی تعلقات سے منقطع کر دیا۔ وہ فطرت سے بیگانہ ہو گیا اور ایک ایسی نسل انسانی وجود میں آگئی جس کی زندگی مظاہر فطرت کی موسیقیت سے خالی ہے۔ سلسلہ روز و شب اور موسموں کا تو اثر اب اس کی زندگی کے اجزاء نہیں رہے بلکہ مدرسہ کے سبق ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس نسل انسانی کی زندگی اب فطری وجود کا جزو نہیں، بلکہ اسباق مدرسہ، جیسی گھڑیوں، اخبارات، کتابوں، سیاسیات اور بجلی کی روشنی کا مبعون مرکب ہے۔

اگر ایک طرف شہری زندگی کی رُست و خیز نے انسان و فطرت کی ہم آہنگی ختم کر دی، تو دوسری طرف قدیم اجتماعات کی پراگندگی کی وجہ سے خود انسانوں کے باہمی تعلقات بھی متزلزل ہو گئے، ہمارے قدیم دیہی تعلقات برادریوں اور پیشوں کی پنچائتوں کی شکل میں صرف انسان کے لئے آسودگی کا باعث تھے بلکہ اس کا اخلاقی سہارا بھی تھے اگر ایک طرف یہ بندشیں عاید کرتے تھے، تو دوسری طرف اتفاق باہمی کے بھی ذمہ دار تھے۔ مشینی اثرات نے آج یہ پُرانے بندھن ڈھیلے کر دیے ہیں اور افراد کو زندگی کی دار و گیر میں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ انسان آج جس قدر تنہا ہو شاید ہی تاریخ میں پہلے ہوا ہو۔

آجکل کے اجتماعات میں نہ کہر بھی ہر فرد دوسرے کو اپنا مخالف سمجھتا ہے اور اگر کوئی قدر مشترک ہے تو یہی کہ انسانوں کے اس جنگل میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ تنہا ہے! اب انسان محروم انسانیت ہے، وہ نہ خدا پر اعتقاد رکھتا ہے، نہ انسان پر بھروسہ ہے۔

اضافہ دولت نے آج زندگی کو زیادہ "خوش حال" بنا دیا ہے، لیکن خوشحالی کے معنی اب بن آسانی کے ہیں۔ اب غریب سے غریب شخص بھی سمٹ کی سڑکوں، بجلی کی روشنی، آراستہ چار فائوں، اور پارکوں کے "آرام و آرائش" سے بہرہ مند ہے۔ اس کی زندگی ہمارے ہی کی زندگی ہے۔ کھیل میں، تہوار میں، سیاسی جلسے میں، اخباروں، رسالوں اور کتابوں کا سیلاب ہے۔ غرض کہ زندگی کی نبض پوری سرعت کے ساتھ چل رہی ہے، اور ایک علمی قسم کی مادیت روح کی جڑوں تک سرایت کر چکی ہے۔

ہم آج بے شک زیادہ دولتمند ہیں، اتنے دولتمند کہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ تھے، لیکن اسی دولت نے ہمیں بندہ ضروریات بنا دیا ہے اور ضروریات کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور انسان کی روح میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کے لئے انسان نت نئی تفریحیں تلاش کر رہا ہے۔

انفرادی بے اطمینانی اور نئی نئی مسرتوں کی تلاش کا لازمی نتیجہ آپس کی رقابت کی شکل میں رونما ہوا ہے۔ دنیا میں کبھی پہلے اتنی دشمنی و رقابت نہ تھی جتنی آج ہے۔ ساری انسانیت آپس میں برسرِ پیکار ہے۔ انسانی روح اب دیران مضطرب، خالی اور سخت ہو گئی ہے۔ قلب انسانی کے لطیف جذبات محو ہو چکے ہیں۔ قلبی اعمال کی جگہ اب اراکلی اعمال نے لے لی ہے۔

قلب و روح کی اس متاع کو ٹامہ دینے کے بعد کاشکے ہم زیادہ عقلمند ہی بن جاتے، لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔ آج انسانی نسل پہلے سے زیادہ غبی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا تعلیم یافتہ انسان انیسویں اور بیسویں صدی کے پڑھے لکھے انسان سے زیادہ زیرک تھا۔ اُس زمانہ کا گڈریہ آج کے کارخانے کے مزدور سے زیادہ عقلمند تھا۔ پرانے زمانہ کی گھروالی، آج کی شوانی بارس کی پیداوار سے زیادہ سمجھدار تھی۔ جب کہ نسل انسانی کی عام ذہنی صلاحیت کمزور نہیں ہوئی ہے تو پھر تعلیم کا جدید مواد دماغوں کو بہتر کیوں نہیں بناتا؟ علوم جدیدہ نے کتابوں، رسالوں، اخبارات، سینما، ریڈیو اور تقریروں کے ذریعہ سے جو اثرات انسانی روح و دماغ اور روح انسانی پر ڈالے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ انسان اب "علمیت پرست" ہو گیا ہے، یعنی کتابوں کے ذریعہ حاصل کی ہوئی "واقفیت" اب اس کا انتہائی مقصود ہے۔ اشیاء کے تصور کی بجائے اب وہ "علمی واقفیت" کا پیاسا ہے، اور پیچ در پیچ خیالات میں گم ہے۔ دنیا اور انسان پر غور کرنے کی بجائے اب اسے "نظریہ آفرینش عالم" اور "نظریہ تخلیق آدم" میں زیادہ لطف آتا ہے۔ وہ

پھولوں سے زیادہ 'نباتیات' کا دلدادہ ہے، جانوروں سے اسے گہری دلچسپی نہیں ہے بلکہ 'حیوانیات' سے ہے۔ انسانی روح کی رنگینوں کی بجائے وہ اب 'نفسیات' کا زیادہ شوقین ہے۔

۲۔ ذہنی معلومات کی افراط نے انسان کو سطحی بنا دیا ہے۔ وہ اس غذائے مفرط کو جذب و ہضم نہیں کر سکتا۔ اس لئے اب یہ اس کو پہلے ہی سے ہضم شدہ صورت میں دی جانے لگی ہے۔ چنانچہ آج کل اکثر آدمیوں کی ذہنی غذا یہی علی گولیاں ہیں جو چند چلتے ہوئے الفاظ یا جملوں کی صورت میں انھیں دیکھاتی ہیں۔

۳۔ علم کی اس افراط کا تیسرا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود علم میں ایک طرح کا طفلانہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ انسان کے قلب میں دنیا کے بے شمار موجودات کی عظمت پیدا ہو، وہ ان کی طرف سے بے پروا سا ہو گیا ہے مثلاً آج کل تعلیمی فلموں کا بڑا چہ چاہے، اور کوئی شک نہیں کہ وہ اشاعت علم کے اچھے ذریعے ہیں، لیکن اگر آپ کسی ایسے مدرسہ یا سینما میں جائیں جہاں یہ فلم دکھائے جا رہے ہوں، تو آپ دیکھیں گے کہ حاضرین بجائے اس کے کہ تعجب و عظمت کے احساسات کے ساتھ، دنیا کے حیوانات یا نباتات کے عجائب کو دیکھیں، لا پرواہ اور بے حس بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کے چہرہ سے بھی احترام کا احساس ظاہر نہیں ہوتا۔ پہلے جب انسان اپنی سیر و سیاحت میں اس قسم کے حقائق دریافت کرتا تھا تو محو حیرت ہو جاتا تھا اور اسے دنیا کے عجائبات سے ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی تھی، لیکن اب یہ تجربے عامۃ الناس کے لئے خالی از معنویت ہیں، اس لئے کہ صرف چند آنے خرچ کر کے ہر شخص انھیں حاصل کر سکتا ہے! حامل کلام یہ کہ آج انسان نے اپنے ماحول کے اثر سے کائنات کا ایک دوسرا ہی نظریہ قائم کر لیا ہے، جو بچوں کی فہم کائنات سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بچے کی کائنات اس کے تخیل سے بنی ہے اور آج کل کے بالغوں کی دنیا اعداد و شمار پر قائم ہے۔ جن معیاروں پر عصر حاضر کے انسان نے دنیا کا یہ تصور قائم کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں: جسامت پرستی، سرعت پسندی اور جدت۔

آج کل ہر جسامت کو عظمت سمجھا جاتا ہے، خواہ یہ "جسامت" شہروں کی آبادی کی ہو، یا ستاروں کے فاصلے کی، یا واردات خود کشی کی تعداد کی یا کسی اخبار کے اڈیشنوں کی۔

سرعت پسندی کی مثالیں آپ کو ہر طرف نظر آئیں گی۔ اب آج کل کسی ہوائی جہاز کا ایک گھنٹہ قبل پہنچ جانا، کسی سرفروش موٹر باز کا تین سو میل کی رفتار سے موٹر چلانا، اخباروں میں کسی واقعہ کی اطلاع کا چند گھنٹہ پہلے چھپ جانا، یہ دنیا کے دلچسپ ترین واقعات سمجھے جاتے ہیں۔ ریکارڈ قائم کرنے کا سودا ہر سرس سہا ہوا ہے، ریکارڈ کے اس ضبط نے کھیل اور ورزش جہانی کی سی اہم چیزوں کو بھی آج کل بالکل بے معنی بنا دیا ہے۔

آج ہم ہر نئی چیز کو محض اس وجہ سے پسند کرتے ہیں کہ وہ نئی ہے۔ یہ جان خیز باتوں کا شوق حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہے۔ ان تینوں خصوصیتوں کے اعتبار سے آج ہم بچوں کی ذہنی سطح پر آگے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آج انسان کی زندگی معنویت سے محروم ہے۔ ہر قسم کے مادی تعلقات سے بیگانہ ہو کر انسان ہر سمت ٹکراتا اور خود اپنے اوپر گرتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کی تکمیل اپنے اندر چاہتا ہے، لیکن پاتا نہیں۔ معاشرہ پر مشینی نظام کے اثرات کا یہ خاکہ بعض طبایع کو بہت شاق ہو گا۔ کوئی کہے گا کہ یہ مبالغہ آمیز ہے، کوئی اسے ایک طرفہ قرار دے گا اور کوئی اسے سرے ہی سے غلط بتائے گا۔

بے شک یہ خاکہ مبالغہ آمیز ہے، لیکن صرف اس معنی میں کہ اس میں بدیہیات کو واضح کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرفہ بھی ہے، اس لئے کہ اس میں اس معاشی دور کی ثقافت کے ہر پہلو پر نظر نہیں کی گئی ہے، بلکہ صرف انہی پہلوؤں کو دیکھا گیا ہے جو اہم ترین ہیں۔ باقی رہا اس کا غلط ہونا! تو اگر کوئی چیز اعداد و شمار اور واقعات سے ثابت ہو جانے کے بعد بھی غلط ہو سکتی ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہ واقعہ ہے کہ آج امریکہ میں ہر پانچویں شخص کے پاس موٹر ہے، اور برمنی میں پچھلے دس سال میں اخبارات کی تعداد دو گنی ہو گئی ہے۔ ان واقعات کو کون بدل سکتا ہے۔ انسانوں کی بہت بڑی تعداد اب تک یہ نہیں جانتی کہ مشینی نظام کا یہ تاشہ جو آج ہو رہا ہے، ہے کیا؟ اس خلاصے سے اگر صرف یہی مطلب حاصل ہو جائے کہ لوگ اپنی ثقافت کے احیاء کے لئے اس معاشی دور کی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں تو ہمارے لئے یہی کافی ہے۔ مشین ایک شیطان ہے جسے منتر پڑھ کر ہم نے اپنا تابع کیا، اب یہ ہمارے سروں پر سوار ہے، اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت وہ منتر بھول گئی ہے جس سے اسے واپس کیا جاسکے۔

(ماخوذ و مقتبس از "سیاست")

سید ولیح الدین احمد بی۔ اے (علیگ)

چند سیاسی کتابیں

جدید دستور کا خاکہ :- از جناب زین العابدین احمد صاحب مترجمہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے جو موجودہ سیاسی گتھی کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۲ روپیہ جنس :- دیہی جنس اور دیہات کی نئی تعمیر پر ایسی کتاب جو دیہات سدھار کے کام کرنے والوں کے لئے مفید ہے۔ از جی سی کمار پالتا صاحب۔ قیمت ۲ روپیہ ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :- از زین العابدین مترجمہ مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی۔ اے (جامعہ) اس مختصر پمفلٹ میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ روپیہ

شیخ ننگار لکھنؤ

تیاگ

(۱)

مضافات کٹوہ، ضلع مرشد آباد میں ایک گاؤں ہے۔ کاتھمن۔ اب تو خیر یہ بالکل ویران و تباہ ہے، لیکن ہم جس زمانہ کا حال بیان کر رہے ہیں، اُس وقت یہ گاؤں بہت آباد تھا۔ یہاں کے لوگ پیر فقیر، سادھو سنت کے بڑے معتقد تھے۔ اسی اعتقاد کی برکت تھی کہ اکثر سادھو اور فقیر یہاں آتے رہتے تھے اور ان کی نصیحتیں سننے کا موقع گاؤں والوں کو اکثر ملتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک سادھو آیا تو پورے ایک مہینہ تک اپدیش دیتا رہا، اُس کا اپدیش یہ تھا کہ اگر ”نردان“ چاہتے ہو تو مایا کے جنجال کو تیاگ دو۔۔۔۔۔ اس سے دور بھاگو۔۔۔۔۔ بیوی، بال بچوں کے پھندے میں پڑ کر مکتی ملت ناممکن ہے۔۔۔۔۔

لیکن اپدیش اور وعظ سننے کے لئے ہوتے ہیں۔ عمل کرنے کے لئے تو ہوتے نہیں ہیں اس لئے سادھو جی اپنا اپدیش دے کر چلے گئے اور گاؤں والے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ مگر نوجوان بدھن پر سادھو کی تعلیمات نے اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ رات دن اسی خیال میں ڈوبا رہتا تھا۔ اُس میں صفائی کا خیال زیادہ آگیا تھا۔ رات دن کے غور و فکر سے اُس کا جسم لاغر ہو گیا تھا اور اُس کا چہرہ اُترا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیوی، روبا سے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ ماں سے بھی کترا کر نکل جاتا تھا۔ ماں اس بات کا کوئی خیال نہیں کرتی تھی کہ وہ سمجھتی تھی جو ان بیٹا اور بہو گھر میں ہیں۔ اُن کے ہنسی خوشی کے دن ہیں دونوں رات دن ہنستے بولتے رہتے ہوں گے۔ مگر روبا اس اچانک تبدیلی سے خوفزدہ ہو گئی اس کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن آخر کار ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے دھڑکتے ہوئے کلیجہ کے ساتھ پوچھا ”آخر یہ کم رات دن کیا سوچتے رہتے ہو۔ نہ کھانے کی پروا ہے، نہ سونے کی فکر، ان دنوں چہرہ بھی بہت اُترا ہوا ہے۔“

بدھن نے روبا کی طرف پیار سے دیکھا۔ اُس کی نظریں روبا کے معصوم چہرہ پر پڑیں اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ بولا:۔ ”یہ گیان دھیان کی باتیں ہیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“

”تو کیا گیان دھیان میں آدمی بے سدھ ہو جاتا ہے؟ تمھارے بابو جی بھی تو برہمن ہیں اور صبح شام روز

پوجا پاٹ کرتے ہیں مگر میں نے تو ان کو کبھی بھی اتنی چنتا کرتے نہیں دیکھا“ روپا نے کہا۔

”نہیں روپا! اس کو گیان دھیان نہیں کہتے ہیں۔ یہ بھگوان کی بھگتی نہیں ہے۔ یہ رسم و رواج کی پوجا ہے۔ جب تک آدمی مایا کے جنجال کو تیاگ نہ دے اُس وقت تک وہ بھگوان کا سچا بھگت نہیں ہو سکتا“ بدھن نے کہا۔
روپا ایک بھولی بھالی لڑکی تھی وہ اس فلسفہ کو بالکل سمجھ نہ سکی اُس نے دل میں کہا ”نہ جانے ان کو کیا ہو گیا ہے؟“ اور کچھ جواب نہ دے سکی۔

(۲)

چیت کا مہینہ تھا اور جو دھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ سفید چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور چیت کی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سارے گاؤں میں ایک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہر شخص سو رہا ہے مگر بدھن اب تک جاگ رہا ہے۔ اُس کے پاس روپا اپنے بچے کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے سو رہی ہے۔

”تو کیا بیوی اور بچوں کی محبت اور ماں باپ کا خیال مجھے نردان کے راستے سے بھٹکا دیگا؟۔ یہ دنیا مایا ہے اور نردان کا حصول بغیر تیاگ کے ناممکن ہے۔ بیوی بچوں کی محبت، ماں باپ کا خیال، دھن دولت، جھوٹی خوشی کی خواہش، سب مایا ہے۔ ان میں حقیقت نہیں ہے۔ یہ سب دلکش جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت فریب ہے۔ ہے ایشور! میری سہاتیا کرو کہ میں ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جاؤں۔ ہے پر بھو! میرے ہر دے کے مندر میں سما جاؤ تاکہ سوائے تیرے اُجالے اور تیری بھگتی کے میرے دل میں کسی اور کی جگہ باقی نہ رہے“

بدھن اُٹھ بیٹھا۔ اب وہ مایا کی زنجیروں کو توڑ چکا تھا، اب وہ آزاد تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار کمرہ سے باہر نکل گیا لیکن ایک لامعلوم شش نے اُس کے پاؤں تھام لئے۔ وہ لوٹ گیا اور اُس نے روپا اور اپنے پیارے بچے کی طرف دیکھا۔ اُس کے دل میں ایک ٹپس اُٹھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی وہ کیفیت زائل ہو چکی ہے۔ وہ پانچ منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر یک بیک خود بخود آہستہ آہستہ کہنے لگا ”نہیں! نہیں! میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ اب یہ دلکش فریب مجھے دھوکا نہیں دے سکتے یہ کہتے ہوئے وہ دیوانوں کی طرح باہر نکل گیا۔

(۳)

وہ کہاں کہاں نہ پھرا — جنگل، پہاڑ، سبھی چھان ڈالے — مگر حقیقی امن و سکون کی روشنی نہ ملی۔ وہ تین سال تک اسی طرح پھرتا رہا یہاں تک کہ وہ گیا پہونچا — جہاں مہاتما بودھ کو ”نردان“ کی روشنی ملی تھی۔ یہاں پہاڑ کی کھوہ میں ایک سادہ دھوکے درشن ہوئے۔ سادہ دھوکے جٹائیں لمبی لمبی تھیں، ناخن بڑھے ہوئے تھے۔ داڑھی اور بھون کے بال بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ سادہ دھونے بدھن کی داستان سنی اور ایک ٹھنڈی سانس

لیکر کہا ”میرے بچے میں تیس سال سے اسی کھوہ میں نردان کی تلاش میں پڑا ہوا ہوں مگر بیکار۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری ساری زندگی یوں ہی رائیگاں چلی گئی۔ میں تم کو کیا راستہ بتلا سکتا ہوں۔ ہاں! آجکل بابا کبیر داس کا بہت چرچا ہے، بنارس چلے جاؤ اور اُن کے درشن بھی کر لو۔ شاید وہ تمہیں راستہ بتلا سکیں۔“

(۴)

بدھن جب بنارس پہونچا تو رات ہو چکی تھی۔ نئی جگہ نہ کسی سے جان نہ پہچان۔ کیا کرتا۔ کہاں جاتا۔ مجبوراً لنگا کے کنارے گھاٹ پر سو رہا۔ چونکہ سفر کی تکان سے چور ہو رہا تھا اس لئے اُس پر نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ نہ معلوم وہ کب تک سو رہا ہوتا۔ مگر پجاریوں کے میٹھے بھجن اور اُشٹان کرنے والیوں کی چیل پہل نے اُس کو جگا دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور کنارے بیٹھ کر تاشادیکھتا رہا۔

بنارس کی دلفریب صبح، ہوا کے سرد جھونکے، مقدس لنگا کی روانی، اُس کا صاف شفاف پانی، چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر پرستار ان فطرت کا ادھر ادھر بھرنے اُن کی دلکش تانیں، ملاحوں کے ترانے، پجاریوں کا بھجن گاتے ہوئے نکلنا۔۔۔ اور ایسے پرکیت وقت میں حسین و جمیل، نازک بدن عورتوں کا سفید ساری پہن کر نہانا۔۔۔ اُن کی جادو بھری آنکھیں، اُن کی سیاہ عنبر افشاں زلفیں، اُن کے ماتھے پر سیندر کا دلکش سرخ ٹیکا۔ اُن کا نہانہا کر باہر نکلنا، اور شرما شرما کر ساریاں بدلنا۔ ایسا منظر تھا کہ ممکن نہیں کہ ایک انسان عقل و ہوش نہ کھو بیٹھے۔ پھر بدھن کے سینہ میں بھی دل تھا۔ بھلا وہ کیونکر اس ہو شرما نظارہ کی تاب لا سکتا تھا۔ ایک گھنٹہ تک اُس پر بے خودی کا عالم طاری رہا۔ اُس نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک فرحت بخش اطمینان اور سکون محسوس کیا۔ نہ معلوم وہ کتنی دیر تک اسی عالم میں رہتا کہ یکایک اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کو کوئی پکار رہا ہو ”بدھن! بدھن! یہ سب مایا کی زنجیریں ہیں ان سے بچ ورنہ نردان کی روشنی کا دروازہ تجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔“

بدھن چونک پڑا اور فوراً دیوانہ وار اُٹھ کھڑا ہوا۔

(۵)

صبح کے تقریباً سات بجے ہوں گے اور حسب معمول بابا کبیر داس مریدوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ بدھن بھٹکتا بھٹکتا پہونچا۔

”میں بابا کبیر داس کے درشن کے لئے بڑے دور کا سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔۔۔۔۔“ بدھن یہیں تک کہنے پایا تھا کہ بابا کبیر داس دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے ”آپ کا سیوک کبیر داس آپ کے سامنے ہے۔“

بدھن کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ بابا کبیر داس کی جو تصویر اُس کے ذہن میں تھی اُس سے وہ بالکل مختلف تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ بابا کبیر داس کوئی سادھو ہوں گے، لمبی لمبی جٹائیں ہوں گی، بڑے بڑے ناخن ہوں گے

اور لنگوٹ کسے، آسن جہائے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ بابا کبیر داس معمولی انسانوں کے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

اس اثنائے میں بابا کبیر داس کی نظر برابر بڑھن کے چہرہ پر جمی رہی۔

”بیٹھو بابا! کہاں سے آئے ہو؟“

”بنگالہ سے“

”کیوں“

”برہما کی تلاش میں“

”افسوس! تم نے ناحق اتنی تکلیف کی برہما تو وہیں تھا۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ چشمہ تمہارے بغل میں بہہ رہا تھا۔ اُس چشمہ کو چھوڑ کر پیاس بجھانے کے لئے اتنا دور دراز سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”لیکن بغیر مایا کے جنجال کو تیاگ کئے ہوئے برہما کیونکر مل سکتا ہے؟“

”میرے بچے! کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما جنگلوں، پہاڑوں، اور ریگستانوں میں رہتا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ برہما ٹیکا لگانے والے برہمن اور داڑھی والے مولویوں کی جاگیر ہے؟ نادان نہ بنو۔ اپنے گھر کو واپس جاؤ۔ برہما تمہارے گھر ہی میں ہے۔ تم اُس سے وہیں مل سکتے ہو۔ گھر باؤزندگی میں دونوں جہاں کا امن و سکون ہے۔ گھر چھوڑ کر جنگلوں میں مارے مارے پھرنے سے کیا فائدہ؟ اگر اُس کا کرم ہو گا تو گھر ہی میں حقیقت کے خوبصورت چہرے سے نقاب اٹھ جائے گی۔ گھر پر رہو۔ گھر رہنے کی جگہ ہے کیونکہ برہما کی سچی روشنی اُس کے گوشہ گوشہ میں جلوہ گر ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ وہ پہاڑوں، جنگلوں، ریگستانوں میں چھپا پھرے، کیونکہ ان میں طرح طرح کے درندے، پرندے، کیڑے مکوڑے لاکھوں سال سے بستے ہیں مگر ان میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اور انسان کی بزرگی اس میں ہے کہ وہ اپنی صورت بگاڑے کیونکہ بندر، ریمچھ، گدھے، اُلو، گدھ بڑے بدصورت ہیں مگر ان میں کوئی بزرگی نہیں ہے۔ اور انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ہوا میں اُڑے یا سمندر اور دریاؤں کے سینوں کو چیرتا ہوا عبور کر جائے کیونکہ رنگ برنگ کی چڑیاں ہوا میں سا لہا سال سے چکر لگا رہی ہیں۔ اور قسم قسم کی مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور ان میں رات دن غوطے لگاتے رہتے ہیں اور اس پار سے اُس پار آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان میں کوئی بڑائی نہیں ہے۔ اس لئے انسان بنو، اپنے ہنسنوں سے ملو، اُن سے خوشدلی کے ساتھ معاملہ کرو، دوست احباب کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ، دشمنوں کی مدارات کرو، اپنی روٹی قوت بازو سے کھاؤ، کھاؤ پیو، خوش رہو۔ اور اسراف مت کرو، کسی کا دل مت دکھاؤ کیونکہ اس سے بڑا کوئی پاپ نہیں ہے۔ ماں باپ کی اطاعت کرو، بیوی، بال بچوں سے محبت کرو، یتیموں، غریبوں اور

مرزا ابوالحسن آصف خاں

نام و نسب ابوالحسن نام، بین الدولہ اور آصف خاں خطاب تھا، باپ کا نام مرزا غیاث بیگ تھا، یہ نیک نام اور خوش قسمت امیر جس نے عہدِ جہانگیری اور دورِ شاہجہانی میں ممتاز اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر حکومتِ مغلیہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا ہے، جہانگیری چہیتی اور مدبر و ہوشمند بیوی نورجہاں کا بڑا بھائی تھا۔

ابوالحسن کا باپ، غیاث بیگ جس نے ہندوستان آکر وزارتِ عظمیٰ کا منصب جلیل اور اعتماد الدولہ کا خطاب حاصل کیا خواجہ محمد شریف طہرانی کا بیٹا تھا خواجہ شروع میں محمد خاں تکلو حاکم خراسان کا وزیر تھا جب محمد خاں تکلو کا انتقال ہو گیا تو خواجہ محمد شریف نے شاہ طہماسپ صفوی کے دربار سے تعلق پیدا کر لیا شاہ طہماسپ نے اس کو مرو کی وزارت پر فائز کر دیا۔ شہنشاہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے مغلوب ہو کر ہندوستان سے بھاگا اور مصیبت وادبار کا مارا ہوا ایران پہونچا تو شاہ ایران نے اسی امیر کے نام اسکی مہانداری اور تواضع کے احکام صادر کئے تھے۔

صاحب سیر المتاخرین نے محمد خاں کے نام ان احکام کا جاری ہونا بیان کیا ہے یہ حکم اکبر نامہ میں موجود ہے۔
خواجہ محمد شریف کے دو بیٹے تھے (۱) آقا طاہر (۲) مرزا غیاث بیگ جس کی شادی علاء الدولہ پسر آقا ملا کی بیٹی سے ہوئی تھی جو ایران کا بہت بڑا امیر تھا۔

باپ کے مرجانے پر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرزا غیاث بیگ اور اس کے بھائی کو اپنے وطن بالوف سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اس سفر میں غیاث بیگ کے ساتھ اس کی بیوی دولہ کے اور ایک لڑکی بھی تھی، اثنائے راہ میں بمقام قندھار ایک اور لڑکی پیدا ہوئی جس نے بعد میں نورجہاں کے نام سے نہ صرف جہانگیر کے اقلیم دل پر بلکہ تمام مملکتِ ہند پر فرمانروائی کی۔ راستہ میں مرزا پر بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں، بہزار دقت و دشواری اس نے فتنہ سیکری میں پہونچ کر شہنشاہ اکبر کی خدمت میں شرفِ باریابی حاصل کیا۔ غیاث بیگ، حقیقت میں ایک جوہر قابل تھا، انشاء، خوشنویسی، شاعری اور دوسرے علوم میں کافی دستگاہ رکھتا تھا، شہنشاہ کی نگاہ انتخاب کا اس پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ جلد ہی دیوان بیوتات ہو گیا اور وقتاً فوقتاً ترقی کے مدارج طے کرتا رہا حتیٰ کہ جہانگیری کے عہدِ حکومت میں اعتماد الدولہ کا خطاب اور وزارت کا منصب ملا۔

علمی استعداد آصف خاں تمام علوم میں بہت اچھی استعداد رکھتا تھا، مگر معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی، اسی لئے مراسلات میں جو القاب اس کے نام کے ساتھ لکھا جاتا تھا اس میں یہ فقرہ ضرور ہوتا تھا:۔
شعلہ افروز فطرت اشراقیاں، دانش آموز طبیعت مشائیاں^۱

خوش نویس، اور زباں داں تھا حساب دانی اور معاملہ فہمی میں جواب نہ رکھتا تھا عمال خالصہ اور دوسرے امراء کے حساب و کتاب کی جانچ خود بغیر کسی اہلکار اور پیشکار کی امداد کے کیا کرتا تھا، امثلہ کا فیصلہ بھی آپ ہی کرتا تھا ان امور میں اُسے کسی اعانت کی ضرورت نہ ہوتی تھی^۲

زمانہ سابق میں جب کوئی امیر بڑے مرتبے پر پہنچ جایا کرتا تھا تو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنا کام دوسروں پر چھوڑ دیا کرتا تھا، جس سے اہل معاملہ کی سخت حق تلفی ہوتی تھی اور چونکہ غیر ذمہ دار اہلکار دیانت و امانت کے جوہر سے عام طور پر محروم ہوا کرتے تھے اس لئے رشوت کی گرم بازاری ہو جاتی تھی، حقیقت میں یہ بہت بڑی کمزوری تھی، چنانچہ افضل خاں غلامی پر بھی مورخین نے یہی الزام لگایا ہے کہ باوجود قابلیت اور حساب دانی کے وہ کاغذات پر خود احکام نہیں لکھتا تھا، لیکن آصف خاں کی یہ خصوصیت کہ وہ امثلہ اور حسابی کاغذات کی دیکھ بھال خود کرتا تھا بے انتہا قابل تعریف ہے۔

عادات و اخلاق آصف خاں نہایت سخی، متواضع اور نرم گفتار تھا، گفتگو باپ کی طرح بڑی نرمی سے کیا کرتا تھا، اہلچشم میں سختی اور تلخی نام کو نہ تھی، آرائش اور تکلفات کو بہت پسند کرتا تھا، بہت ہی خوش خوراک اور پُر خور تھا، دن رات میں ایک من شاہجہانی غذا کھاتا تھا، لیکن بیماری کے دوران میں عرصہ کی علالت نے خوراک اتنی گھٹادی تھی کہ صرف ایک پیالہ خود آب پیتا تھا۔ اس کے مصارف بہت زیادہ تھے، موجودہ زمانہ میں وہ عقل میں بھی نہیں آسکتے، مگر اس وقت کا ہندوستان آج کے ہندوستان سے بہت مختلف تھا، عام طور پر خوش حالی اور فراغ بالی کا دور دورہ تھا، رعایا افلاس اور فاقہ کی تکالیف سے واقف نہ تھی، ہندوستان کی آمدنی ہندوستان ہی میں رہتی تھی، اس لئے اہل ہند کی خوشحالی کچھ عجیب خیز بھی نہ تھی جب عوام کی یہ کیفیت تھی تو امراء کا کیا ذکر ہے، امراء تو آج بھی عیش و عشرت میں اتنا روپیہ صرف کر دیتے ہیں کہ ایک غریب اور فاقہ کش انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا، لیکن آصف خاں اُس عہد زریں کے امراء میں بھی امتیاز رکھتا تھا، اُس زمانہ میں خوش غوری میں آصف خاں دنیا بھر میں شہرت رکھتا تھا۔

گویند دریاں وقت بزمین الدولہ و مرزا ابوسعید و باقر خاں نجم ثانی بخوش المعاشی شہرہ آفاق بودند^۳

باوجود اس کے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کی آمدنی میں غرباء کا حصہ نہ تھا، آج سے سو دو سو سال پہلے جہاں آدمی کے لئے علم و شجاعت ضروری تھی وہاں سخاوت بھی لازمی تھی جس طرح آج ہم چوری، زنا اور اسی قسم کی دوسری بد اخلاقیوں کو اپنے لئے باعث شرم و ذمات خیال کرتے ہیں اُسی طرح نخل و امساک کو اس وقت سخت ترین عیب خیال کیا جاتا تھا شعراء خاص طور پر ایسے سرمایہ داروں کی ہجو کیا کرتے تھے جن کے دامن پر کنجوسی کے داغ نظر آتے تھے، اگرچہ عہد حاضر میں بھی اس عادت رذیلہ کی تعریف نہیں کی جاسکتی لیکن ماحول ایسا ہے کہ اسے برا بھی نہیں کہا جاسکتا، آج کسی کو سخی یا نجیل کہنا خود اپنی طماعی اور گدا طبعی کا ثبوت ہم پہنچانا ہے، بلکہ حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ سرمایہ داری نے تمام اچھے اوصاف کو شکست دیکر شرافت و نجابت کی مسد پر قبضہ کر لیا ہے اور عزت و شرافت کا معیار اب علم و شجاعت یا دوسرے انسانی اوصاف پر قائم نہیں رہا بلکہ دولت و ثروت یا حکومت پر رکھ لیا ہے، اگرچہ مسلمانوں کی عالم گیر اخوت اور ان کے نظام مذہب کا تقاضہ آج بھی وہی ہے جو دو سو سال پیشتر تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ سخاوت کی صفت سے یہ قوم قطعی محروم نہیں ہوتی، لیکن زمانہ بڑی تیزی سے اسلاف کی امانتیں چھین رہا ہے، خوف ہے کہیں آگے چل کر یہ چیز بھی اس کی دست درازیوں کی نذر نہ ہو جائے بہر حال آصف خاں سخی تھا، غریب اور مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتا تھا، شہر میں بالاکھاٹ اور اس کے نواحی علاقہ میں امساک باریاں کی وجہ سے سخت قحط پڑا بڑے بڑے غنی محتاج ہو گئے، حتیٰ کہ مدت تک کتے کا گوشت بکری کے گوشت کی جگہ فروخت ہوتا رہا، نان بانی رات کو گلی ہوئی ہڈیاں اٹھالاتے اور ان کو پیسکر اٹا شامل کر کے روٹیاں پکالیتے اور دو لہندوں سے قیمت وصول کر لیتے، ایک دن ایک عورت نے قاضی کی عدالت میں استغناء کیا کہ میں نے اپنے ہمسایہ کو اس شرط پر اپنا بچہ دیدیا تھا کہ اس کو کاٹ کر پکائے اور مجھے بھی کھلائے مگر اس نے خود ہی کھا لیا مجھے کچھ نہیں دیا، غرض عجب آفت اور قیامت تھی، آدمی، آدمی کو کھائے جاتا تھا ہزاروں بھوکے مر گئے اور شہر کے شہر ویران ہو گئے چنانچہ اس غمناک سال کی تاریخ ہی کسی نے ”غم“ سے نکالی، بادشاہ برہان پور میں تھا اس نے بڑے بڑے اور مشہور شہروں میں لشکر جاری کئے بادشاہ کے ساتھ یمن الدولہ آصف خاں نے بھی لشکر جاری کئے جن میں روٹی اور دلیا اس کثرت سے پکایا جاتا تھا کہ ادھر ادھر سے جو لوگ بھوک کے ستائے ہوئے آتے تھے وہ خوب شکم سیر ہو کر کھا لیا کرتے تھے۔

بادشاہ، بیگمات اور شاہزادوں کی دعوت کے موقع پر آصف خاں نہایت تکلف اور اہتمام سے کام لیا کرتا تھا بڑی بڑی تزیینات کرتا اور مکان کو اندر باہر سے خوب سجاتا تھا، نوکر بھی نہایت عمدہ پوشاک پہنتے اور اپنی اپنی خدمات ادب اور قربانیت سے انجام دیتے تھے، چونکہ جہانگیر اور شاہ جہاں سے آصف خاں کی قریبی رشتہ داری تھی اس لئے اکثر دعوت کا اتفاق ہوتا تھا اور ہر مرتبہ انھیں تکلفات کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

۱۰۲۸ء میں آصف خاں نے اپنے مکان پر جہانگیر کی دعوت کی اور سو لاکھ روپیہ کا ایک لعل پیش کیا، جہانگیر نے اپنی توڑک میں اپنے قلم سے اس ضیافت کی کیفیت لکھی ہے:-

روز مبارک شنبہ پانزدہم آصف خاں در منزل خود کہ بغایت جائے بصفاء و دلنشیں بود مجلس عالی و جشن بادشاہانہ آراستہ التماس ضیافت نمود متمسک اور پایہ قبول بخشیدہ با اہل محل تشریف بردہ شد، و اس رکن السلطنت ایں عطیہ را از مواہب غیبی شمرده و رافرونی پیشکش و ترتیب مجلس غایت اغراق بکار بردہ بود از جواہر گراں بہادر لہفت ہائے نفیس و اقسام مختلف انچہ پسند افتاد برگزیدہ تتمہ بشار الیہ عنایت نمود از جملہ پیشکشہائے اولیٰ است بوزن دوازده و نیم ٹانگ کہ یکہ لک بیست و پنج ہزار روپیہ خریدہ بود قیمت مجموع پیشکش او انچہ مقبول افتاد یک لک و شصت و ہفت ہزار روپیہ شدہ۔

۱۷ شعبان ۱۰۲۸ء کے جشن نوروز میں شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو آصف خاں نے دس لاکھ روپے نذر کئے۔
۶ رجب ۱۰۲۸ء کو شاہجہاں کی جوہلی میں جو اس نے لاہور میں کافی روپیہ صرف کر کے تعمیر کی تھی گیا تو اس نے ۶ لاکھ کی پیشکش کی۔

اگرچہ ہماری رائے میں ان واقعات کو "سخاوت" سے زیادہ فضول خرچی سے تعلق ہے، خصوصاً اس لحاظ سے کہ سلطنت مغلیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر مرجاتا تھا تو اس کی تمام جائیداد اور املاک ضبط کر لی جاتی تھی، تاہم وہ بادشاہ پرستی کا دور تھا اور بادشاہ کے ساتھ محبت کرنا ایک حد تک جزو ایمان ہو چکا تھا اس لئے یہ اغراق قابل مذمت بھی نہیں کم سے کم ان واقعات سے آصف خاں کے مصارف کا تو اندازہ کیا ہی جاسکتا ہے۔

خطابات و مناصب | آصف خاں بڑی جاہ و شہرت اور شان و شوکت کا امیر تھا، جہانگیر اور شاہجہاں کے فیض التفات سے اس کو جو مراتب حاصل ہوئے وہ شاہان مغلیہ کے عہد میں اور کسی امیر کو نصیب نہیں ہوئے، بلکہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی بادشاہ کے عہد میں کسی نے یہ عزت نہیں پائی جو آصف خاں کو ان دو بادشاہوں کے دور فرمانروائی میں حاصل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ آصف خاں اپنی قابلیت اور کاروائی کے لحاظ سے اس کا مستحق ضرور تھا کہ اس پر وہ نوازش شاہانہ ہونی چاہئے تھی جو ہوئی لیکن خوش قسمتی سے اس کو نورجہاں ایسی بہن بھی ملی تھی اسی کے ساتھ قدرت نے اسے ارجمند بانو ایسی بیٹی بھی مرحمت کی تھی، ان دونوں بیگمات سے ان کے شوہروں کو جو عشق اور شفقت کی تھی وہ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان کے عزیزوں اور درشتہ داروں کو عہدے اور مرتبے ملتے، نیز

ان کے اعزاز و وقار میں اضافہ ہوتا چنانچہ یہی ہوا، جب آصف خاں کی چھوٹی بہن مہر النساء (نور جہاں) جہانگیر کے عقد میں آئی تو اس کے خاندان کی عزت و وقعت میں چار چاند لگ گئے نور جہاں کے تمام رشتہ داروں بلکہ ملازموں اور غلاموں تک کو عمدہ عمدہ خطابات اور عہدے ملے، باپ اعتماد الدولہ اور وزیر ہوا، بڑے بھائی یعنی ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب اور میر سامانی کا عہدہ ملا، حتیٰ کہ جس عورت ”دل آرام“ نے نور جہاں کو دودھ پلایا تھا، وہ بھی صدر انات ہوئی۔ عورتوں کو جو امدادیں اور وظائف دئے جاتے تھے ان میں ”صدر الصدور“ دل آرام کی مہر پر احکام جاری کر دیا کرتا تھا۔

۱۰۲۸ھ کے واقعات میں جہانگیر اعتماد الدولہ کی ضیافت اور پیشکش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اکبر کے زمانہ سے آج تک کسی امیر نے ایسی پیشکش نہیں کی، یہ لکھتے لکھتے اس کے قلم میں محبت اور خصوصیت کا جوش پیدا ہوتا ہے اور آخر میں یہ جملہ بے اختیار ادا ہو جاتا ہے۔ ”الحق اور ابداً گیراں چہ نسبت لے“ واقعی اعتماد الدولہ کو دوسرے امراء سے کوئی نسبت نہ تھی، وہ نور جہاں ایسی مدبر اور ہوشمند عورت کا باپ تھا، جو جہانگیر کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ سب نور جہاں اور جہانگیر کے ازدواج ہی کی بدولت ہوا اور جن لوگوں کو مناصب و مراتب عطا کئے گئے ان کی اہلیت و قابلیت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا اس میں شک نہیں کہ اس ازدواج نے نور جہاں کے خاندان کو بادشاہ کی عنایات شاہانہ کا زیادہ مستحق بنا دیا تھا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی ندرت ہو ہر بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں اپنے اعزہ اور جاں نثاروں پر یہی نوازشیں کی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خاندان اپنی قابلیت و اہلیت کے باعث اسی رعایت و توجہ کا استحقاق رکھتا تھا اور وزارت و امارت اس کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی خواجہ محمد شریف ایران میں وزیر رہ چکا تھا، مرزا غیاث بیگ ایران کے ایک صوبہ کی حکومت پر فائز تھا۔ پھر کوئی تعجب نہ کرنا چاہئے اگر وہی عزت جو اس کے وطن میں اُس سے چھین لی گئی تھی ہندوستان آکر حاصل ہو گئی اور شاہ جہانی عہد میں تو آصف خاں کو جو کچھ ملا وہ اُسی کی گوشنیل اور سر فرشتیوں کا صلہ تھا اور یہ کہنا قطعاً صحیح ہے کہ شاہ جہاں کو محض بیوی کی وجہ سے ہندوستان کی سلطنت نصیب ہوئی، ظاہر ہے کہ جہانگیر اول سے آخر تک اپنی محبوبہ نور جہاں کے ہاتھ میں تھا، اس کی خلافت منشاء وہ کوئی کام نہ کر سکتا تھا اور نور جہاں کی کیفیت یہ تھی کہ شاہ جہاں سے اس کو سخت خصومت تھی، شاہ جہاں سے اس نے باپ کو بظن کیا، شاہ جہاں پر بغاوت کا الزام لگایا اور اُسے بغاوت پر آمادہ بھی کیا، پھر اسی کے ساتھ شرفِ حضورِ می سے

محروم کیا، اس کی دولت و ثروت برباد کی، اور اُسے مجبور کیا کہ دشتِ غربت میں ادھر ادھر مارا مارا پھرے اسکے برخلاف اس نے اپنے داماد شہریار کو فروغ دیا ہر وقت اپنے پاس رکھا، امراء کو اس کی اطاعت پر مائل کیا اور ہر طرح اُسے تقویت پہنچائی، ان حالات میں کوئی قوت نہ تھی جو سلطنت کا تاج شہریار کے سر سے اتار کر شاہجہاں کے سر پر رکھ دیتی جس کے پاس نہ خزانہ تھا، نہ فوج تھی، نہ لشکر تھا نہ امراء تھے، اگر آصف خاں کو اپنی بیٹی ارجمند بانو (ممتاز محل) کے پاس خاطر سے شاہجہاں کی رعایت منظور نہ ہوتی تو وہ بھی اپنی بہن کی ہمنوائی کرتا جس کو سلطنت کا تمام ساز و سامان میسر تھا، اگر ایسا ہی ہوتا تو یقیناً تاریخ میں شاہجہاں کا نام بحیثیت شاہجہاں کے محفوظ نہ ہوتا، یہ سب آصف خاں ہی کی حسن تدبیر اور شجاعت و سرفروشی کا کرشمہ تھا کہ شاہجہاں دکن میں منہ چھپاتا پھر رہا تھا اور قلعہ لاہور کی فضائیں اس کے نام کے خطبہ اور سکے سے گونج رہی تھیں۔ ایسا کیوں تھا ایک بھائی، اپنی بہن سے کیوں لڑ رہا تھا کیوں اس محسن اور بیوہ بہن کو نظر بند کرنے کی تدبیریں کر رہا تھا، اس کا جواب صرف ایک ہی ہے یعنی بھائی کی محبت پر شفقت پر ہی تھا آگئی تھی، آصف خاں اگر صرف نورجہاں کا بھائی ہوتا اور ارجمند بانو کا باپ نہ ہوتا تو یقیناً صورت حال وہی ہوتی جو نورجہاں پیدا کرنا چاہتی تھی مگر تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور صرف اس لئے نہیں ہوا کہ شہریار نورجہاں کا داماد تھا اور شاہجہاں آصف خاں کا، پھر کیونکر ممکن تھا کہ آصف خاں بھانجی کے سہاگ پر بیٹی کے سہاگ کو تیار کر دیتا اور شہریار کی جگہ شاہجہاں کو کھول و مقبول کرتا۔

مگر جہانگیر کی خوش نصیبی اور اقبال مندی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حسین و جمیل، عاقل و دانشمند بیوی کے ساتھ ہی اُسے دو ایسے جوانمرد، عاقل اور فرزندانہ مشیر بھی مل گئے (اعتماد الدولہ اور آصف خاں) جن کے فیضِ صحبت سے جہانگیر کے بہت سے عیوب دور ہوئے اس کی خود پسندی اور خود پرستی، خدا پرستی میں تبدیل ہو گئی شراب جو رام رنگی کے نام سے خلوت و جلوت میں شریک و سہم رہتی تھی صرف رات کی ہمدرد رہ گئی، رات کو پیتا اور دن کو بڑی مستعدی اور دانائی سے عدالت کے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔

جہانگیر کے چھٹے سن جلوس میں ابوالحسن کو اعتقاد خاں کا خطاب ملا، جہانگیر نے مختصر طور پر اپنی توڑک میں اس کا ذکر کیا ہے:-

”ابوالحسن سپہر اعتماد الدولہ را بختاب اعتقاد خانی سرفرازی بخشیدم و سپہر آئی معظم خاں را بمناسب لایق

سرفراز ساختہ بہ بنگالہ پیش اسلام خاں فرستادم۔“

یہ سب سے پہلا خطاب تھا، جو ابوالحسن کو دیا گیا اس کے بعد ۹۷۰ جلوس (۱۵۷۳ء) میں آصف خاں کا خطاب اور ۹۷۱ ہزاری منصب عنایت ہوا یہ خطاب ابوالحسن کے لئے تنہا نہ تھا بلکہ اس کے خاندان میں درآدمیوں کو اس سے

پہلے بھی مل چکا تھا چنانچہ جہانگیر خود لکھتا ہے :-

”در تاریخ سوم منصب اعتقاد خاں را کہ دو ہزاری ذات و پانصد سوار بود سہ ہزاری ذات و سوار مقرر فرمودم

و بہ خطاب آصف خانی کہ دو کس ہم از سلسلہ آہنہا بدین خطاب سرفرازی یافتہ اند سر بلند ساختم“

مرزا غیاث الدین کو جو ممتاز محل کا نانا یعنی ابوالحسن کا خسر تھا یہی خطاب حاصل تھا اور غیاث الدین کے بھتیجے مرزا قوام الدین کو جو ۱۶۸۵ء میں عین عالم جوانی میں اسوقت وار دہند ہوا تھا جب یہاں کے اورنگ حکومت پر اکبر متکون تھا، آصف خاں کا خطاب ملا تھا اس کے بعد مسلسل اور متواتر اضافوں کے بعد آصف خاں چھ ہزاری (چھ ہزار سوار) کے منصب پر پہنچ گیا۔ یہاں پر پہونچ کر بھی اس کی ترقی کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رکا اور بڑھتے بڑھتے وزارت سپہ سالاری کے عہدے پر پہونچ کر نو ہزاری ہوا، ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ حسب موقع آگے بیان کیا جائے گا۔

آصف خاں اولاد کے معاملہ میں بھی بہت خوش قسمت تھا اس کے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں تھیں، پھر اولاد شادی بیاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر وسیع ہوتا گیا اور بہت سے پوتے، پوتیاں، اور نواسے نواسیاں ہوئیں۔ آصف خاں کا سب سے بڑا بیٹا شائستہ خاں تھا جو باپ کی زندگی ہی میں بڑے بڑے کار نمایاں کر چکا تھا اور بہار کا ناظم تھا شاہنواز خاں ولد عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی اس کے عقد میں تھی، معلوم ہوتا ہے کہ شاہنواز خاں کی یہ لڑکی بھی ہمت مردانہ کی مالک تھی، مہابت خاں نے جب جہانگیر کو قید کر لیا اور ساتھ ہی آصف خاں بھی گرفتار ہو گیا تو شائستہ خاں کی بیوی غالباً اپنے شوہر کی پھوپھی نور جہاں کے پاس تھی، جہانگیر مہابت خاں کی دلدادہ کی لئے اس سے عجیب عجیب قسم کی گفتگو کیا کرتا تھا یہ بھی کہا کرتا تھا کہ شاہنواز کی بیٹی سے ہو شیار رہنا وہ کہتی ہے میں مہابت خاں کو گولی سے اڑا دوں گی۔

تاریخ میں ابوطالب اور معظم خاں کے نام سے دو اور بیٹے آصف خاں کے ملتے ہیں، لیکن قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم خاں کو ہی شائستہ خاں کا خطاب ملا ہے میرے پاس اسوقت آثار الامراء کی پہلی جلد موجود ہے۔ دوسری اور تیسری جلد بھی ہوتی تو میں اس امر کی زیادہ تحقیق کر سکتا، بہر حال آصف خاں کا دوسرا بیٹا ابوطالب کو سمجھنا چاہئے۔

تیسرے بیٹے کا نام مرزا بہمن یار تھا یہ بہت آزاد لڑکا بالی، عیش پسند اور بے پروا تھا، اس کا موروثی خطاب اعتقاد خاں اس کو حاصل تھا، چار ہزاری منصب تھا، دارا شکوہ کی لڑائی کے بعد عہد عالمگیری میں

پانچ ہزاری ہو گیا تھا اس وقت اس کا بڑا بھائی شائستہ خاں ناظم ہنگالہ تھا۔ ۱۸۲۷ء میں اس نے انتقال کیا، نہایت سیدھا، سچا، آزاد اور فقیر دوست تھا، ایک دن ایک کوچہ گرد مجذوب سے ملنے گیا بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا چونکہ یہ بات اس کے درجہ امارت سے گری ہوئی تھی بادشاہ نے اعتراضاً پوچھا بندہ بائے بادشاہی میں سے وہاں کوئی او بھی تھا، اس نے بے تکلف اور برجستہ جواب دیا، صرف یہی روسیہ تھا باقی سب خدا کے بندے تھے، اس کا ایک لڑکا محمد یار خاں بہت مشہور تھا، ایک بیٹی فاطمہ بیگم مفتخر خاں کی بیوی اور نگ زیب کی نہایت معتاد و صد النساء تھی۔ منجملہ پانچ بیٹیوں کے ایک یعنی ارجمند بانو شاہ جہاں سے منسوب تھی، جو ممتاز محل کے نام سے آج تک مشہور عالم ہے اور اس کا مقبرہ ”تاج محل“ دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے اس نے باپ کی زندگی میں بمقام برہان پوریٰ زچگیری انتقال کیا اس کے بطن سے شاہجہاں کے بہت اولاد ہوئی، شاہجہاں کو اس سے بڑا انس تھا اس کے بعد اس نے پھر شادی نہیں کی۔ ارجمند بانو کی حقیقی بہن جو ایک ہی تھی سیف خاں کے عقد میں تھی، سیف خاں جہانگیر کے عہد حکومت میں احمد آباد کا صوبہ دار تھا اس نے شاہجہاں کے دکن سے آکرہ جاتے وقت بغاوت کا ارادہ کیا تھا۔ شاہجہاں نے اس کی جگہ شیر خاں کو تعینات کیا اور اس کو نظر بند کرنے کا حکم دیا، لیکن ممتاز الزمانی بیگم نے اپنے بہنوئی کی سفارش کی، اور بادشاہ نے اس کو خدمت پرست خاں کو بھیج کر اپنے پاس بلالیا۔

آصف خاں کی ایک بیٹی آصف الدولہ، جملہ الملک اسد خاں محمد ابراہیم سے منسوب تھی۔ ایک لڑکی جعفر خاں عمدۃ الملک کو بیاہی گئی تھی جو آصف خاں کا بھانجا بھی تھا، اس لڑکی کا نام فرزانہ بیگم اور عرفیت ”بی بی جیو“ تھی۔ ایک لڑکی میر خلیل الخطاب بہ ”خان زماں“ پسر اعظم خاں جہانگیری کے عقد میں تھی۔

آصف خاں نے آگرہ، دہلی، کشمیر اور لاہور میں بہت سے مکانات بنائے اور باغات لگائے تھے۔

عمارات لاہور میں ایک حویلی بیس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی تھی، ۶ رجب ۱۰۴۳ھ کو شاہجہاں لاہور میں وارد ہوا تو اس حویلی کو دیکھنے گیا آصف خاں نے اس موقع پر ۶ لاکھ کی پیشکش کی، آصف خاں کے مرنے پر یہ حویلی اس کے نواسے دارا شکوہ کو ملی۔

آصف خاں جہانگیر کا سالہا تھا اور یہی سب سے پہلا رشتہ ہے جو خاندان شاہی سے تعلقات شاہی سے قائم ہوا۔

۱۰۲۱ھ میں ابوالحسن آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو سے جو بعد میں ”ممتاز محل“ سے موسوم ہوئی شاہزادہ خرم یعنی شاہجہاں کا عقد ہوا۔

اس سے پہلے ۱۸۷۱ء میں دونوں کی منگنی ہو چکی تھی اور جہانگیر نے اپنے ہاتھ سے دہن کو انگوٹھی پہنائی تھی، ربیع الاول ۱۲۹۱ھ میں منگنی کے پانچ سال پانچ دن بعد جب شاہزادہ کی عمر ۲۰ سال اور بیگم کی ۱۹ سال تھی شادی ہوئی، صاحب اثر الامراء نے ۱۲۹۱ھ میں شادی کا ہونا بیان کیا ہے حالانکہ جہانگیر نے اپنی توڑک میں ۱۲۸۱ھ کے حالات میں شادی کا تذکرہ کیا ہے، جہانگیر خود اپنے سمدھی کے گھر گیا اور نذر قبول کی، توڑک میں لکھتا ہے:-

”چوں صبیہ اعتماد خاں ولد اعتماد الدولہ را بہت خرم خواستگاری نمودہ بودم و مجلس کدخدائی اور درمیان

بود روز پنجشنبہ ہیچیم خور داد بمنزل اور رفتہ یک روز یک شب آنجا بودم و پیشکشہا گزرا شد“

یہ شادی اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت کامیاب ثابت ہوئی، زوجین میں اتنی محبت تھی جسے بے تکلف عشق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

امراء کے لڑکوں اور بیٹیوں کی شادیاں شاہان مغلیہ کے آئین کی رو سے بغیر بادشاہ کی اجازت کے نہ ہو سکتی تھیں آج بھی ایسی ریاستوں میں انھوں نے ریاست اور جاگیرداروں کے لئے ایسی پابندیاں موجود ہیں، اگرچہ بظاہر یہ رسم اچھی نہیں، لیکن سیاست اور امور سلطنت سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے، بادشاہ اکثر شادیاں سیاسی مقاصد کے پیش نظر کیا کرتے تھے اور منشاء یہ ہوتا تھا کہ اس تعلق سے امراء میں خلوص اور یکجہتی پیدا ہو، عداوت و خصومت کے جذبات کم ہو جائیں چنانچہ اکبر نے اکثر شادیاں ایسی ہی کی ہیں عبدالرحیم کی شادی، مرزا عزیز کوک کی بہن سے اسی مصلحت کی بنا پر ہوئی تھی، مرزا عزیز کا تمام خاندان بیرم خاں کا جاتی دشمن تھا ایسی صورت میں اندیشہ تھا کہ اس کا بیٹا عبدالرحیم بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکیگا، اس لئے بادشاہ نے مرزا عزیز کی بہن سے اس کا عقد کر دیا تاکہ اس کی دشمنی دوستی میں تبدیل ہو جائے، اور شادیاں بھی اس قسم کی ہوئی ہیں، بیرم خاں اور سلمہ سلطان کا ازدواج بھی قطعاً سیاسی مصالح پر مبنی تھا، جہانگیر بھی اس سیاسی ضرورت سے باخبر تھا، اس نے نورجہاں کی بیٹی کو جو شیرا فگن خاں سے تھی، اپنے بیٹے شہریار سے منسوب کیا، اسی طرح شاہجہاں کا عقد آصف خاں کی بیٹی سے کیا، منشاء صرف یہ تھا کہ خاندان کا شیرازہ مجتمع رہے، ایک دوسرے کا ہمدرد اور شریک غم ہو، آپس کی خانہ جنگی اور قتل و غارت سے سلطنت کے ٹکڑے نہ ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ شاہجہاں اور ارجمند بانو کی شادی محض شرافت اور نجابت ہی کی بنا پر ہوئی ہو جس کا جہانگیر کو بہت خیال تھا، اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کی یہ حکمت عملی کامیاب نہیں ہوئی اور یہ رشتہ آگے چل کر بہت سی خرابیوں اور خانہ جنگیوں کا باعث ہوا، خود بہن بھائی یعنی آصف خاں اور نورجہاں میں اتحاد قائم نہ رہ سکا آخر میں آصف خاں نے اپنی بہن کو نظر بند بھی کیا وہ بھی آصف خاں کی گرفتاری کے خیال میں رہی ایک طرف شاہجہاں مدعی سلطنت تھا اور

۱۔ توڑک جہانگیر کی منشا

آصف خاں بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے اس کی حمایت کر رہا تھا۔ دوسری طرف شہر یار جہانگیر کا چھوٹا بیٹا اور نور جہاں کا داماد بادشاہت کے جھوٹے خواب دیکھ رہا تھا اور نور جہاں کی تائید جہانگیر کی زندگی ہی سے اس کے شامل حال تھی، اگرچہ انجام بخیر ہوا اور حق بحقدار رسید کی ضرب المثل صادق آئی، مگر اس حسن انجام میں جہانگیر کی اصابتِ رائے کو کیا دخل ہے، جبکہ وہ شاہ جہاں کو ”بے دولت“ کا خطاب دے چکا تھا، اور بیوی کے اغوا سے اس پر لشکر کشی بھی کر چکا تھا، پھر نور جہاں کی اُن سیاسی غلطیوں کو تو کسی طرح نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا جو صرف اسی رشتہ کی وجہ سے سرزد ہوئی اس نے جہانگیر کو شاہ جہاں کے خلاف کیا، اور شاہ جہاں کو مجبور کیا کہ وہ باپ کے مقابلہ میں تلوار کھینچ کر میدان میں آئے، مہابت خاں کی بغاوت اور جہانگیر کی اشرارت بلکہ خود نور جہاں کی نظر بندی کو بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے ذیل کے اکثر واقعات میں اُن خانہ جنگیوں کی جھلک نظر آئیگی جو محض اس رشتہ کی وجہ سے برپا ہوئیں۔

کوثر چاند پوری

(باقی)

چند قابل مطالعہ کتابیں

مضامین محمد علی :- مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ۔ یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تین مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان جاگ اُٹھے۔ قیمت مجلد ۱۰
میدانِ عمل :- ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول جو ان کے تمام کچھلے کارناموں پر بھاری ہے۔ قیمت مجلد ۱۰
بیوہ :- منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ضمناء بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا پڑے۔ قیمت مجلد ۷
شہری آزادی :- اس کتاب میں بیرونی ممالک کے انجنیوں اور اُن کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے اُن کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴

بینچر نگار لکھنؤ

کیا قرآن خدا کا کلام ہے؟

پچھلے مہینے، ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے، میں نے ظاہر کیا تھا کہ قرآن مجید انسانی کلام ہے، خدا کا کلام نہیں۔ اس پر مذہبی حلقوں میں کافی بھینپی پیدا ہو گئی اور باوجود اس کے کہ میرا کفر والحادیہ کے نزدیک دیرینہ مرض کی حیثیت رکھتا ہے، ان کو میری یہ بات بہت ناگوار ہوئی۔ (حالانکہ مجھے بالکل ناگوار نہیں ہوتا اگر کوئی شخص قرآن کو کلام خداوندی کہتا ہے) اور منجملہ دیگر الزامات کے ایک الزام مجھ پر یہ بھی عاید کیا گیا کہ میں خدا اور رسول کی توہین کرتا ہوں۔ میں یقیناً اہل مذہب کے فتوائے کفر والحادیہ کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن مجھے واقعی تکلیف ہوتی ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ میں خدا و رسول کی توہین کرتا ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ خدا کی عظمت اور رسول کی رسالت ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہوں اور میرے نزدیک اہل مذہب ہی کی طرف سے خدا و رسول کی زیادہ اہانت ہوتی ہے۔

میں آج کی صحبت میں ذرا تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن پاک کو خدا کا کلام کہنا نہ صرف یہ کہ خود قرآن کے منشاء کے خلاف ہے بلکہ اس صحیح تصور و حرانیت کے بھی منافی ہے جس کی تعلیم رسول اللہ نے پیش کی ہے۔ میں اس بحث میں نہ احادیث و تفاسیر سے استناد کروں گا، نہ اقوالِ سلف سے کیونکہ یہ سب جھگڑے کی چیزیں ہیں۔ بلکہ خود کلام پاک کی آیات سے یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ کیا قرآن واقعی خدا کا کلام ہے اور اگر ہے تو کس مفہوم میں۔

۱۔ چونکہ قرآن کے متعلق اہل مذہب کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ سے پہونچایا گیا تھا اس لئے نامناسب ہوگا اگر سب سے پہلے وحی کی حقیقت معلوم کر لی جائے۔

وحی کے لغوی معنی ”اشارہ سریع“ یا ”الہام بالسرعة“ کے ہیں۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم ”بر محل سوچہ بوجہ کے فقرہ سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوت کسب و اکتساب سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ فطری و ولایت ہی اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحی ”خدا کی دین“ اور نتیجہ ہے اس فطری قوت کا جو فطرتاً انسان میں ولایت کی گئی ہے اور چونکہ یہ قوت انبیاء میں زیادہ پائی جاتی تھی اور ان کا ہر قول و فعل صرف نفع انسان کی خدمت کے لئے ہوتا تھا اس لئے یہ کہنا نام درست نہیں کہ ان کی ہر بات وحی کا نتیجہ تھی اور ان کے منہ سے جو کچھ نکلتا تھا وہ اسی اشارہ خداوندی کے ماتحت ہوتا تھا۔

وحی کا جو مفہوم میں نے متعین کیا ہے وہ میری ذاتی رائے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خود قرآن پاک سے ظاہر ہوتا ہے۔ سب سے پہلی غلطی جو وحی کا مفہوم متعین کرنے میں روا رکھی گئی یہ ہے کہ وحی کو انبیاء و رسل کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انبیاء و رسل کے پاس وحی بھیجے جانے کا ذکر کلام پاک میں پایا جاتا ہے، لیکن غیر انبیاء بلکہ حیوانات و جمادات پر بھی وحی کا نازل ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ سورہ قصص میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اِمَامِ مُوسٰى اِنِ ارْتَضِ

ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی بھیجی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں

ظاہر ہے کہ موسیٰ کی ماں نبیہ نہ تھیں اور اس لئے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ کو دودھ پلائیں اور اس طرح وحی کے معنی وہ نہ رہے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں۔

خدا نے انسان کے علاوہ حیوانات پر بھی وحی بھیجی ہے۔ سورہ نحل کی آیت ہے:-

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلٰی النّٰحْلِ اِنِ اتَّخَذَ مِنْ اَجْجَالٍ مَّوَدِّعًا مِّنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُونَ

ہم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ پہاڑوں، درختوں اور مکانوں میں اپنا چھتا بنائے۔

اس جگہ وحی کے معنی اس فطری ذکاوت کے ہوئے جس سے کام لیکر شہد کی مکھی اپنا خوبصورت چھتا طیار کرتی ہے۔ جمادات پر وحی نازل ہونے کا ثبوت سورہ زلزال کی اس آیت سے ملتا ہے:-

یَوْمَ نُنْزِلُ السَّيَّارَ اِلٰی رَکَبٍ اَوْحٰی لَهَا

اُس دن زمین اپنی خبریں اس طرح بیان کرنے لگی جیسے خدا نے اس پر وحی نازل کی ہو۔

ظاہر ہے کہ زمین زبان نہیں رکھتی اس لئے اس کا یہ بیان بہ زبان حال ہوگا اور اس جگہ وحی کا مفہوم ”ماحول و اقتصاد ماحول“ قرار پایا۔

کلام مجید میں ایک جگہ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ سورہ ”خم“ میں ارشاد ہوتا ہے:-

فَقَضٰہُمْ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَّوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمٰوٰۃٍ اَمْرًا

پس ہم نے دو دن میں سات آسمانوں کی تخلیق کا حکم دیدیا اور ہر آسمان میں اس کے نظم و اصول کو وحی کر دیا۔

اس جگہ وحی کے معنی وہی ودیعت کرنے کے ہوئے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن میں وحی کا لفظ کس قدر وسیع معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق بڑی حد تک

اس فطری صلاحیت یا ذکاوت سے ہے جو خدا نے ایک انسان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کر دی ہے۔ لیکن آپ شکر تعجب کریں گے کہ الہامِ وحی کا استعمال بُری باتوں کے لئے بھی کیا گیا ہے۔

سورۃ شمس میں نفسِ انسانی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

”فَالْهَمُّهَا فُجُورٌ أَوْ تَقْوَاةٌ“

یعنی اس میں برائی بھلائی الہام کی۔ یہاں بھی الہام اسی فطری صلاحیت و عدم صلاحیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

لفظِ وحی بھی ایک جگہ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بُری باتوں کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ النعام کی یہ آیت:-

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا

اس طرح ہم نے ہر نبی کے ساتھ اس کے دشمن ساتھ لگا دئے ہیں اور یہ وہ شیاطین ہیں جو ایک دوسرے کو لغو باتوں کی وحی کرتے رہتے ہیں۔

اس جگہ وحی کے معنی ”بُری بات بچھانے“ کے ہوئے۔ یہاں تک تو لفظِ وحی کے اس مفہوم سے بحث ہوئی جو مختلف جگہ پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اب خود قرآن پاک سے جو تعلق وحی کا ظاہر کیا گیا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے:-

سورۃ نجم میں ارشاد ہوتا ہے:-

وَبِأَنبِطَاقٍ مِّنَ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ

رسول ہوائی باتیں نہیں کرتا۔ بلکہ وہ سب کچھ وحی ہے اور ایک بڑی قوت والے نے اسے سکھایا ہے۔

سورۃ النعام میں رسول اللہ کی زبان سے یہ الفاظ کہلاوائے جاتے ہیں:

وَإِذْ يَأْتِيَنَّكَ الْوَحْيُ فَقُلْ إِنِّي خَشِيتُ أَنِ مَّا أُوحَىٰ إِلَيَّ هُوَ الْقُرْآنُ لَا أُنذِرُكُمْ بِهِ

مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمہیں بری باتوں کی طرف سے ڈراؤں۔

سورۃ بنی اسرائیل میں قرآن کو حکمت کی کتاب بتایا جاتا ہے:

ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ

سورۃ النعام میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِيَ خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ

اِنْ اتَّبِعِ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ۔ (اے رسول کہہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا

حال جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اسی کا اترنا کرتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے۔
ان تمام آیات سے قرآن کو وحی بتایا گیا ہے، لیکن صرف اس کے علم و حکمت ہونے کے لحاظ سے اور کہیں یہ ظاہر
نہیں کیا گیا کہ اس کے الفاظ بھی خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں۔

خدا کسی سے ہمکلام نہیں ہو سکتا، نہ کوئی انسان اس سے ہمکلام ہو سکتا ہے اور عبد و معبود کی اس باہمی گفتگو
کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف وحی کے ذریعہ سے چنانچہ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے:
وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يَكْلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ۔

اس آیت سے اس عقیدہ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ موسیٰ، خدا سے باتیں کیا کرتے تھے۔
مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیوں پیدا ہوا کہ قرآن کے تمام الفاظ خدا کے بولے ہوئے الفاظ ہیں اور فرشتہ ان
الفاظ کو رسول اللہ کے پاس لایا کرتا تھا۔ اس کے متعلق ہم آئندہ بیان کریں گے، لیکن ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی
طرف سے جو آیتیں کلام پاک کی پیش کی جاتی ہیں پہلے انہیں سن لیجئے
سورہ زخرف کی آیت ہے:

ان جعلناہ قرآنًا عربیًا لعلکم تتقون، وانہ فی اُمّ الکتاب لدینا علیٰ حکیم۔
اس آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اُس ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔
یہ اُم الکتاب ہے اس کی صراحت میں وہ کلام مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:
بل ہو قرآن مجید فی لوح محفوظ
یعنی قرآن ایک تختی میں محفوظ ہے۔

ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ام الکتاب کا ایک حصہ ہے جس کا دوسرا نام لوح بھی ہے۔
لیکن جس وقت ہم سورہ رعد کی حسب ذیل آیت پڑھتے ہیں تو ہم کو ”لوح و ام الکتاب“ دونوں کا صحیح مفہوم معلوم
ہو جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ہو اللہٰی انزل علیک الکتاب مشہد آیات محکمات ہذہ ام الکتاب و آخر مشاہدات
اس آیت میں ”ام الکتاب“ کو ”آیات محکمات“ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ”مضبوط و مستحکم نشانیاں“ یا
بالفاظ دیگر وہ قوانین فطرت جو اٹل ہیں اور جن میں تبدیلی ممکن نہیں اور یہی مفہوم لوح یا تختی کا بھی قرار پایا۔
۲۔ اب عام روایات کی بناء پر اس عقیدہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو قرآن کے ام الکتاب اور لوح محفوظ میں
مرسوم ہونے کے متعلق عام مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے۔ قصص الانبیاء کی روایت ملاحظہ ہو۔
عرش اعظم سے نیچے اُس نے ایک دائہ مروارید پیدا کیا اور اس موتی سے اس نے لوح محفوظ بنائی۔ اس

لوح کا طول ... سال کی راہ اور عرض تین سو برس کی راہ تھا۔ اس کے حاشیہ پر خدا نے اپنی قدرت سے لعل و یاقوت کی منبت کاری کی تھی بعد ازاں قلم کو حکم ہوا کہ ”لکھ اسے قلم میری تمام مخلوق کی نسبت اور جو کچھ تاقیامت ہو گا اس کے متعلق میرے علم کا حال“۔

قلم نے پہلے لوح محفوظ پر ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ لکھا اور پھر تمام مخلوقات کی نسبت قیامت تک کا حال لکھا یہاں تک کہ درخت کا پتہ ہلنے، گرنے یا اوپر اڑنے تک کا حال درج کیا۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوح محفوظ ایک مادی تختی تھی جو موتی سے بنائی گئی تھی اور جس پر خوشنویسوں کی رسم کے مطابق چاروں طرف حاشیہ میں گلکاری بھی کی گئی تھی۔ اس لغویت کے ساتھ ہی اس بیان سے یہ عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق سے قبل ہی قرآن لوح محفوظ میں درج ہو گیا تھا، لیکن اس خیال کی تکذیب خود قرآن پاک کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اس میں زبور، توریت و انجیل وغیرہ کا بھی ذکر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے پہلے ہی لوح محفوظ میں درج ہو گئی ہوں گی، ورنہ ایسی چیز کا ذکر جو وجود میں نہ آئی ہو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوح کے عقیدہ کا خیال بہت قدیم ہے۔ اہل بابل کا عقیدہ تھا کہ ہر شخص کی قسمت کا حال ایک لوح پر لکھا ہوا محفوظ ہے۔ یہی خیال توریت میں منقل ہوا جیسا کہ کتاب التثاباب، آیتہ الغایۃ ۵ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ نے خدا کے حکم سے ویسی ہی دو تختیاں پتھر تراش کر بنائیں جیسی اس نے تور دی تھیں، تو خدا نے ان پر احکام عشرہ تحریر فرمائے اور موسیٰ کو خدا نے حکم دیا کہ وہ ان تختیوں کو ببول کی لکڑی کے صندوق میں محفوظ رکھے۔ اور پھر یہ خیال یہود سے مسلمانوں میں منتقل ہوا، چنانچہ عبرانی زبان میں جو لفظ تختی کیلئے استعمال ہوا وہ یہی ہے جو عربی میں پایا جاتا ہے۔

چونکہ رسول اللہ کے زمانہ میں یہود و نصاریٰ عام طور پر یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کے توریت و انجیل لوح محفوظ میں منقوش خدا کے پاس موجود ہیں اور اس عقیدہ سے عوام بہت متاثر ہوتے تھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی سمجھ لیا کہ اگر قرآن توریت و انجیل کی طرح خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے تو اسے بھی لوح محفوظ میں درج ہونا چاہئے اور اس باب میں متعدد حدیثیں گھڑ لی گئیں۔

۳۔ یہاں تک میں نے روایتی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈال کر واضح کر دیا ہے کہ قرآن کا وحی ہونا کیا مفہوم رکھتا ہے اور اس کو لوح محفوظ میں درج سمجھنا ایک مستعار عقیدہ ہے جو قدیم بابلیوں اور یہود و نصاریٰ سے لیا گیا ہے

۱۔ معلوم نہیں راہ کس کی مراد ہے، انسان کی، طیور کی یا حشرات کی اور اگر موٹر یا ہوائی جہاز کی رفتار کو سامنے رکھا جائے تو یہ راہ کتنے دن کی قرار پائے گی۔

اب درایتی حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کو اس معنی میں خدا کا کلام کہنا کہ اس کا ایک ایک لفظ خدا کی زبان سے ادا کیا ہوا لفظ ہے، حد درجہ جاہلانہ عقیدہ ہے جس سے ایک طرف خدا کے تصور وحدانیت کو صدمہ پہونچتا ہے اور دوسری طرف رسول کی عظمت کو۔

اگر ہم الفاظ قرآن کو بھی الہامی اور منطوق خداوندی کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کی صفت نطق مادی اسباب کی محتاج ہوگی اور یہ اسلام کے اُس تصور وحدانیت کے منافی ہے جو مادیت کے بعید ترین خیال سے بھی پاک و منزہ ہے۔

گفتگو، نطق، الفاظ، ان سب کے تخیل کے ساتھ ہم مجبور ہیں کہ ان تمام آلات نطق یا عضلات و اعصاب وغیرہ کو بھی سامنے رکھیں جو ادائے صوت کے لئے ضروری ہیں اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خدا ایسے الفاظ بغیر کسی مادی اسباب یا ذرائع کے پیدا کر سکتا ہے تو ایسا فرض کرنے کی نہ کوئی دلیل موجود ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

خدا کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے تو قطعی اس امر کی ضرورت نہیں کہ وہ انسان کی طرح چلتا پھرتا، بولتا چلتا فرض کیا جائے اور رسول کی برتری اخلاق کے ثبوت کے لئے بھی ضروری نہیں کہ خدا اُس سے باتیں کرے یا اس کی زبان میں کوئی کتاب تصنیف کر کے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے اس کے پاس بھیج دے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ رسول کی عظمت کے منافی ہے کہ جو کچھ وہ کہے وہ خود اس کے دماغ کا نتیجہ نہ ہو۔

رسول کو محض ایک ایسے پیغامبر کی حیثیت دینا، جو خود کوئی عقل یا ارادہ نہ رکھتا ہو، جسے خود کچھ کہنے سننے کا اختیار نہ ہو، ایک ڈاکیہ کی سی حیثیت دیدینا ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو عام انسانی سطح سے بھی نیچے گرا دینا ہے۔ ہم رسول کو مصلح قوم کہتے ہیں، لیکن کیا وہ شخص صحیح معنی میں مصلح ہو سکتا ہے جو وقت و زمانہ کے لحاظ سے خود کوئی حکم لگانے یا فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہ رکھتا ہو، جو خود قوانین اصلاح وضع نہ کر سکتا ہو اور جو اپنی ذاتی عقل و رائے سے کام لینے کا مجاز نہ ہو۔ فوج کے ایک جنرل کا یہ کام نہیں کہ وہ صرف مرکز کے احکام کی تعمیل کرے اور خود اپنی سوچ بوجھ سے کام لیکر فوج کو نہ لڑائے۔ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وقت و موقعہ کے لحاظ سے خود مناسب احکام صادر کرے کیونکہ وہ جنگ کو کامیاب بنانے کا ذمہ دار ہے۔

اگر قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک حرف خدا کا بتایا ہوا ہے تو پھر اس میں رسول اللہ کا کیا کمال ہے اور خود ان کے ذاتی شرف پر اس سے کیا روشنی پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا دنیا میں جواب نہیں اور اگر خدا کوئی کلام کر سکتا ہے تو واقعی اس کو ایسا ہی فصیح و بلیغ ہونا چاہئے، لیکن اس سے رسول اللہ کی ذہنی بلندی یا قوت اختراع کیا ثابت ہوتی ہو

الغرض قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا ترسم ہونا یقین کرنا، صحیح اسلامی خیال نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یہود و نصاریٰ سے۔ قرآن میں جہاں جہاں ”کلام اللہ اور کلمات اللہ“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اُن سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ احکام پیش کر کے ان کی تعمیل چاہی ہے۔

یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضا یہی ہے کہ قرآن کو انھیں کا کلام سمجھا جائے اور اس کے وحی ہونے کا مفہوم وہی قرار دیا جائے جو اس سے قبل کے صفحات میں ظاہر کیا گیا ہے۔

”نگار“ کے خاص نمبر

جنوری ۱۹۷۲ء (غالب نمبر) - غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے صفحات ۱۵۶ مع تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ - علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۵ء (اردو شاعری نمبر) - اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۳۶ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے ساتھ جس میں ادیب نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۶ء (ہندی شاعری نمبر) - ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحات ۱۶۹ قیمت ۲ روپیہ

جنوری ۱۹۷۷ء (ڈرامہ اصحاب کہف) - خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ صفحات ۱۴۴ - قیمت ۱ روپیہ - علاوہ محصول

جنوری ۱۹۷۸ء - تاریخ اسلامی ہند - یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ صفحات ۱۵۲ قیمت ۱ روپیہ - علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۷۹ء (مصحفی نمبر) - بعض عنوانات ہیں: حیات مصحفی - اردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ تنویاں - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۶۴ - قیمت ۱ روپیہ - علاوہ محصول۔

جنوری ۱۹۸۰ء (نظریہ نمبر) - بعض عنوانات: - نظریہ کاسمک - شاعری پر تبصرہ - نظریہ اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ - صفحات ۱۴۸ - قیمت ۱ روپیہ - علاوہ محصول

پینچر نگار لکھنؤ

بعض حیرتناک سیاسی اکتشافات

ایک مغربی ماہر سیاسیات کا تفصیلی تبصرہ

دو جنگوں کے درمیان کا زمانہ

سٹرکے ڈلیاکس (K. Zilliacus) کی ایک کتاب ہے "Between Two Wars" سر نورمن انجل (Sir Norman Angell) - مصنف کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- موصوف یورپ کی آٹھ زبانوں کے ماہر ہیں، جنگ عظیم کے دنوں میں انھوں نے نہایت اہم فوجی خدمات انجام دی ہیں، اتحادیوں نے سائبریا (Siberia) پر چڑھ کر کیا تھا اس میں بھی یہ شریک تھے مجلس اقوام کے قیام کے وقت سے مجلس کے اہم عہدوں پر فائز رہے، یورپ کی وہ بڑی شخصیتیں جنکو مجلس اقوام سے تعلق ہے ان سے ان کی شناسائی ہے اور یورپ کے بڑے بڑے سیاستدانوں سے ان کی دوستی ہے۔ گزشتہ بیس سال میں یورپی سیاست کے مد و جزر کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا ہے۔ یہ سب چیزیں اور ان کا طویل تجربہ اس کا ضامن ہے کہ ان کا بیان یورپی مسائل کے باب میں یقیناً بہت اہم ہوگا۔

یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے 'ماضی' اور 'حال'۔ پہلے میں مسئلہ ۱۸۷۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں حکومت کے سیاسی رجحانات پر گفتگو کرتے ہوئے بہت سے ایسے واقعات اور رجحانات کا مصنف نے اظہار کیا ہے جو اب تک عوام کی نظروں سے پنہاں تھے۔ دوسرے باب میں ان حالات اور واقعات پر تبصرہ ہے جو جنگ کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ان واقعات و حالات کی روشنی میں نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور مستقبل سے متعلق پیشین گوئیاں کی گئی ہیں۔ یہ کتاب مئی ۱۹۳۸ء میں لکھی گئی تھی اور آج مصنف کی پیشین گوئیوں بڑی حد تک درست اور صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ مقالہ اسی کتاب کی تلخیص ہے۔ (اڈیش)

ماضی | جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی سیاست میں جمہوریت کا یہ حال تھا کہ سول سروس کے لئے مقابلہ کا

استعمال تو ہوتا تھا مگر دفتر خارجہ کی تمام اسامیوں کو پُر کرنے کے اختیارات ایک انتخابی بورڈ کے سپرد تھے جو اس کا خیال رکھتا کہ اس محکمہ میں صرف اعلیٰ طبقے کے افراد منتخب ہوں۔ طبقہ عوام پارلیمنٹ کی وساطت سے داخلی معاملات میں نہ اپنے اختیارات ایک حد تک استعمال کر سکتا تھا، مگر جہاں تک خارجی معاملات کا تعلق ہے ان کو سختی کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں رکھا جاتا تھا چنانچہ اس سے لیکر ۱۹۳۷ء تک سیاست خارجہ سے متعلق صرف تین مباحثے اور ایک درجن سوالات ایوان میں ہوئے اور ہر موقع پر حکومت نے اراداً صحیح حالات ظاہر کرنے سے احتراز کیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ عوام کو ان معاملات کے سمجھنے کا اہل نہیں سمجھتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خارجی پالیسی صرف حکمران طبقہ کے مفاد سے متعلق سمجھی جاتی ہے اور ایسی حالت میں اگر جمہور کو خارجی سیاست میں درخور حاصل ہو جائے تو ہر دو طبقوں میں باہم تصادم کا اندیشہ ہے۔ اُنیسویں صدی میں جمہوریت نے حکمران طبقہ کی حکومت کو پے پے شکستیں دیں البتہ خارجی معاملات اور مسئلہ دفاع یہ دو باتیں ایسی تھیں جن پر انقلاب کا اثر سب سے بعد میں ہوا، جب اعلیٰ طبقہ کے مفاد متصادم نہ ہوتے تھے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گزشتہ جنگ عظیم کی گھٹا سر پر آگئی تو عوام الناس اور حکمران طبقے کے مقاصد جنگ میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عوام کو اس کا یقین تھا کہ یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے چھوٹی ریاستوں کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے، عسکریت کے مقابلہ میں جمہوریت کو باقی رکھنے کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ معاہدات کی حیثیت صرف ردی کاغذ کے پرزوں کی نہیں ہے لیکن درپردہ حقیقت یہ تھی کہ ہمارے حکمران صرف اپنے شہنشاہی مفاد کے لئے تو اُن کو (Balance of Power) کو برقرار رکھنے کے لئے لڑ رہے تھے۔ برطانیہ نے اعلان جنگ صرف اس لئے کیا تھا کہ اگر جرمنی نے روس کو شکست دیدی تو یورپ میں اُس کی طاقت بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور ہمارے مقابلے میں وہ خم ٹھوک کر آجائے گا۔

شہنشاہی مفاد کے پیش نظر اتحادی حکومتوں نے ایک طرف عثمانی سلطنت اور جرمنی کی نوآبادیات کو آپس میں تقسیم کر لینے کا سمجھوتا کر لیا تھا اور دوسری طرف عوام کو یقین دلایا جاتا تھا کہ وہ ہرگز اپنی حکومت میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اتحادیوں کی امیدوں کے خلاف جنگ نے بالکل مختلف صورت اختیار کر لی۔ ایک طرف تو سوائے کے آغاز ہی میں عوام جنگ کی تکان محسوس کرنے لگے، دوسری طرف امریکہ کی شرکت جنگ و انقلاب روس نے صورت حال بالکل بدلدی اور ہر طرف عالمگیر انقلاب کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہو کہ اتحادیوں نے اس موقع پر بڑی ذہانت اور دلیری سے کام لیا۔ ایک طرف انھوں نے امریکہ کے پریسیڈنٹ ویلسن (Wilson) کی بیٹھ ٹھونکنا شروع کی اور دوسری طرف مزدوروں کے سر پر ہاتھ رکھ کر ان کو اپنے قابو میں لے آئے۔ ہر چند انقلاب روس کا مقابلہ کرنے میں انھیں ناکامی ہوئی پھر بھی جنگ کو طوالت دینے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

ولسن سے کس طرح فائدہ اٹھایا گیا مسٹر ولسن (صدر جمہوریہ امریکہ) مزدور اور معتدل دونوں پارٹیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے عوام اُن کو اپنا ہمدرد سمجھتے تھے۔ چنانچہ ولسن کی تجاویز کی غموگاہ اور اُنکے چودہ نکات کی خصوصاً ان لوگوں نے پر زور تائید کی فرانس، اٹلی اور برطانیہ یوں ہی ان تجاویز سے خائف تھے، عوام الناس کی تائید نے اور بھی ان کے حواس خراب کر دیے کیونکہ ان تجاویز سے اتحادیوں کے مفاد کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔

چنانچہ ہمارے ارباب حکومت عوام کے سامنے تو اپنی تقریروں میں ولسن کے نکات کی پر زور تائید کرتے تھے مگر دہرہ دہرہ انھوں نے ولسن کی ناکامی کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے اور ولسن کی انتھاک کو ششوں کے باوجود اتحادی طاقتیں اپنے خفیہ معاہدوں سے دستبردار ہونے کے لئے طیارہ ہوئیں۔ ولسن کی دلی خواہش یہ تھی کہ حکومتیں ایمانداری کے ساتھ صلح و امن کی راہ اختیار کریں اور ایک ایسا متفقہ بیان شائع کریں جو اعتدال پسند طبقہ اور مزدوروں کے لئے بھی قابل قبول ہو۔ سب سے پہلی کوشش اُس نے روس کے ”مارچ واسے“ انقلاب کے بعد کی لیکن وہ ناکام رہا۔ اُس کو یقین تھا کہ اتحادی اگر اپنے مقاصد جنگ میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیں تو انقلابی روس، علیحدہ معاہدہ صلح سے باز رہے گا۔ (آگے چل کر ولسن کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا)۔ لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ہر چند ولسن نے صلح کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے چند ماہرین کا تقرر کیا۔ لیکن اتحادی اس اعلان کے لئے بھی تیار نہ ہوئے کہ ”یہ لڑائی صرف قیام امن کے لئے لڑی جا رہی ہے نہ کہ نوآبادیاتی اغراض کے لئے۔“ جب ”امریکی صلح کا پروگرام“ طیارہ ہو گیا تو ولسن نے کرنل ہاؤس (Colonel House) کو یورپ روانہ کیا تاکہ وہ ”اتحادیوں کو سمجھائے اور جرمن پروپگنڈے کو کمزور کرنے اور روس کے ساتھ (اتحادیوں کے) تعلقات برقرار رکھنے کے لئے مقاصد جنگ کا ایک متفقہ بیان شائع کرنے پر مایل کرے۔“

مگر جب کرنل ہاؤس یورپ پہنچے تو اُن کو صورت حال بالکل برعکس نظر آئی ایک طرف پیرس میں ولسن کی تجاویز کے ساتھ ہمدردی مفقود تھی اور دوسری طرف لائڈ جارج (وزیر اعظم برطانیہ) نے برطانوی قدامت پسندوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے اُن سے بڑے بڑے وعدے کر لئے تھے۔ ۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیرس میں اتحادیوں کی ایک کانفرنس ہوئی، کرنل ہاؤس نے اس موقع پر سخت کوشش کی کہ حسب ذیل تجویز پر سب متفق ہو جائیں :-

”اتحادی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ لوگ یہ لڑائی ظلم اور تاوان جنگ کی خاطر نہیں لڑ رہے ہیں۔ اُن کی تمام قربانیوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کے سرے سے عسکریت کا سایہ اٹھ جائے اور تمام قوموں کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ جس طرح سمجھیں اپنی زندگی گزاریں اور اپنی فلاح و بہبود کے لئے جو مناسب تدابیر چاہیں اختیار کریں۔“

مگر اتحادی اس بات کے سننے پر بھی آمادہ نہ تھے اور کسی طرح بھی انھوں نے حصول نوآبادیات کے خیال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ کرنل ہاؤس اپنی اس ناکامی سے حد درجہ بد دل ہوا اور اُس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۷ء) میں لکھا:-

”مجھ کو اتحادی اقوام کے سپاہیوں اور جہازرانوں کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، جن کی آنکھیں ہم سب لوگوں پر لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جس وقت کانفرنس کے لئے ہم سب یہاں یکجا ہوتے ہیں تو مجھ کو اس کا پورا احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنا فرض نہیں ادا کر رہے ہیں۔“

اس موقع پر صدر ولسن نے اپنے مشہور عالم چودہ نکات شائع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ تو ہوا کہ اتحادی ممالک کے معتدلیں اور مزدور یہ سمجھنے لگے کہ اتحادی حکومتیں یہ لڑائی حصول امن کی خاطر لڑ رہی ہیں مگر خود اتحادی طاقتیں اپنے شہنشاہی مفاد سے دستبردار نہ ہوئیں۔ ہر چند ان لوگوں نے بعد از خرابی بسیار ولسن کی تجاویز کو قبول تو کر لیا مگر اس میں بھی ان لوگوں کی ایک گہری چال تھی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ کی پوزیشن سے اتحادی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہاؤس نے اپنی ڈائری (مورخہ ۳ مارچ ۱۹۱۷ء) میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ:-

”یہ صلح اُس قسم کی نہ ہوگی جس کی مجھ کو توقع تھی۔“

امریکہ کی شرکت جنگ کے وقت سے صدر ولسن نے اتحادی ممالک کے معتدلیں اور مزدوروں کو اس کا یقین دلایا کہ شرائط صلح پر ایمانداری کے ساتھ عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب صلح کانفرنس میں اُس کو ناکامی ہوئی تو اُس کے سامنے صرف دو راہیں تھیں، ایک تو یہ کہ جن حکومتوں کے ساتھ اُس نے ناتا جوڑا تھا، اُن کو خیر باد کہے یا اُن عوام کے ساتھ غداری کرے جنھوں نے اس پر اعتماد کیا تھا اور اُس نے موخر الذکر صورت کو ترجیح دی۔

مزدوروں کو کس طرح فریب دیا گیا انگلستان کی مزدور پارٹی دوسرے ممالک کی مزدور پارٹیوں کی طرح اس تجویز کی پابند تھی کہ:-

”طبقہ دار جنگ اور سیاسی صورت حالات کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جنگ کو روکنے کے لئے وہ موثر انداز میں ہر امکانی تدبیر کو بروئے کار لائے، اگر اس کے باوجود جنگ چھڑ جائے تو اُن کا فرض ہے کہ وہ فوراً مداخلت کر کے جنگ کا خاتمہ کر دیں اور جنگ کی وجہ سے جو سیاسی اور اقتصادی تعطل پیدا ہو اُس کے ذریعہ سے عوام کو بیدار کریں تاکہ جلد سے جلد سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو جائے۔“

لیکن اس تجویز کے باوجود برطانیہ کی مزدور جماعت کے بیشتر افراد نے جنگ کی تائید کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو اس کا پورا یقین دلایا گیا کہ یہ لڑائی بلجیم کے تحفظ، معاہدات کے احترام اور جمہوریت کی مدافعت کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ برطانوی جنگی سرگرمیوں کے سلسلہ میں مزدور پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کا اعتراف

خود لائڈ جارج نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ :-

”اگر مزدور پارٹی اس جنگ کی مخالفت کرتی تو جنگ کا موثر انداز میں جاری رکھنا محال ہو جاتا اور کامیابی کی راہ میں بڑی دشواریاں حائل ہو جاتیں۔ ٹریڈ یونین (Trade Union) کے سب سے بڑے لیڈر نے ہماری کامیابی کے لئے دوران جنگ میں جان توڑ کوششیں کیں۔ مزدوروں کی امداد کے بغیر جنگ میں کامیابی محال کرنا قطعاً ناممکن تھا۔“

جب حکومت نے جبریہ فوجی بھرتی کا پہلا مسودہ پیش کیا تو مسٹر آر تھر ہنڈرسن (Arthur Henderson) اور دوسرے مزدور لیڈروں کے لئے تھوڑی سی دشواری پیدا ہو گئی کیونکہ ٹریڈ یونین کانگریس اپنے اجلاس برٹشل (Brussels) میں حکومت کی اس تجویز کے خلاف اظہار ناراضگی کی ایک تجویز پاس کر چکی تھی۔ آخر کار جب مسٹر اسکوتھ نے مسٹر ہنڈرسن کو اس کا یقین دلادیا کہ اس مسودہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ صنعتی حلقوں میں جبریہ فوجی بھرتی ہوگی تو مسٹر ہنڈرسن نے اس مسودہ کی حمایت میں تقریر کی ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسکوتھ کی وزارت بدل کر قومی حکومت قائم ہوئی اور مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم نے مزدور لیڈروں کو قومی حکومت میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے کہا :-

”یہ بالکل ظاہر ہے کہ خواہ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا اس ملک میں کوئی حکومت چل ہی نہیں سکتی جب تک کہ مزدور پارٹی (میں یہاں پر تائید کا لفظ استعمال کروں گا) بلکہ اس کے ساتھ اتحاد عمل نہ کرے۔“

اسی تقریر میں آگے چل کر انھوں نے یہ بھی کہا کہ :

”یہ تو کسی کے خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ کوئی وزیر مزدور نمائندوں کے مشورہ کے بغیر صلح کی گفت و شنید کا آغاز کر سکتا ہے۔“

مگر جبوقت مسٹر لائڈ جارج یہ تقریر فرما رہے تھے اُسی وقت وہ اپنی جگہ پر یہ بھی طے کر چکے تھے کہ ان کی پیش رو حکومت نے مزدوروں سے جو وعدے کئے ہیں اُس کو وہ پورا نہ کریں گے۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں انھوں نے کابینہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسا مسودہ تیار کیا جائے جس کی رو سے ساٹھ سال تک کی عمر کے تمام لوگ فوج میں بھرتی کئے جائیں اور اگر ممکن ہو تو عورتوں کو بھی مستثنیٰ نہ کیا جائے مگر کابینہ نے اس کے بجائے نیشنل سروس بورڈ (National Service Board) کا قیام زیادہ مناسب سمجھا اور اس محکمہ کے افسر اعلیٰ مسٹر نیول چیمبرلین کو بنایا گیا۔ مگر مزدور جماعت کی مخالفت کی وجہ سے یہ اسکیم ناکام رہی اور مسٹر چیمبرلین کو ان کی نااہلی کی وجہ سے برطرف کر دیا گیا۔ انقلاب روس سے پہلے انگلستان کی مزدور پارٹی حکومت کے پیچھے پیچھے لگی رہتی تھی اور صلح کے باب میں اُسکے کوئی ذاتی خیالات نہ تھے مگر انقلاب روس نے صورت حال بدل دی۔ زار کی حکومت کا خاتمہ کرنے میں روسی

مزدوروں کو جو کامیابی حاصل ہوئی اُس نے اس ملک کے مزدوروں کو بھی بہت کافی تقویت پہنچائی اور انہیں ایک نوع کی خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور ملک کی تمام مزدور جماعتوں نے یہ تجویز پیش کرنی شروع کر دی کہ ”موجودہ حکومت، صلح کی طرف قدم اٹھانے کی اہل نہیں ہے“

۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مزدور پارٹی اور ٹریڈ یونین کانگریس کا ایک متحدہ قومی جلسہ ہوا جس نے جنگ کو ختم کرنے کے متعلق مزدوروں کی ایک متعینہ پالیسی کا اظہار کیا۔ یہ تجویز ولسن کی تجاویز اور روسی انقلابیوں کی تجاویز سے بالکل ملتی جلتی تھی۔ مزدوروں کے اس اقدام نے اتحادیوں کو بڑی حد تک پریشان کر دیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں جنگ کی مخالفت میں جلسے ہو رہے تھے اور فوجی بھرتی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں جس سے عام انقلاب کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

مسٹر لائڈ جارج نے اس موقع پر مزدوروں کی تجویز کو سامنے رکھ کر ایک تقریر مرتب کی اور آزاد خیال معتدین کو بلا کر سنائی۔ اُس کے بعد ٹریڈ یونین کے جلسہ میں اسی تقریر کو دہرایا اور سب سے زیادہ زور اس پر دیا کہ مزدوروں کی صلح کی تجویز کسی حال میں بھی ”اُس تجویز صلح سے مختلف نہیں ہے جو ہماری حکومت نے مرتب کی۔ ہم میں اس کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا مقصد جنگ یورپ کے صرف اُس قانون کی حفاظت کرنا ہے جس کو آج ٹھکرایا جا رہا ہے۔ ہم معاہدوں کی شرائط کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں اور بحیم کو دوبارہ زندہ کرنا ہمارا مقصد ہے“

خود مسٹر لائڈ جارج کا بیان ہے کہ اس تقریر کے ساتھ ہی تمام مخالفت کا فور ہو گئی اور دولاکھ پچاس ہزار وہ لوگ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے جو مستثنیٰ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ہی مزدور پارٹی نے ”اہل برطانیہ کے مقاصد جنگ“ کے نام سے ایک بیان شائع کیا جس میں خاص طور سے وزیر اعظم کی تقریر کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ:-

”۵ جنوری ۱۹۱۷ء کو وزیر اعظم نے ٹریڈ یونین کانگریس کے نمائندوں کے سامنے جو معرکہ آرا تقریر کی ہے وہ

اُن تمام تقریروں میں اہم ترین درجہ کی ہے جو اب تک دنیا کے سیاستدانوں نے موضوع جنگ پر کی ہیں“

مسٹر لائڈ جارج نے اپنے بیان کو زیادہ وزنی بنانے کے لئے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بالفور کو ہدایت کی کہ وہ صدر جمہوریہ امریکہ مسٹر ولسن سے استدعا کریں کہ وہ بھی ایک بیان اس کی تائید میں شائع کریں۔ مسٹر لائڈ جارج نے کسی جگہ بھی اپنی اس ہدایت کا کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ کہنے کی کوئی وجہ تھی مگر کزنل باؤس کے کاغذات (The intimate papers of Col. House) میں وزیر خارجہ کا یہ پیغام (مورخہ ۵ جنوری ۱۹۱۷ء) موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

”کچھ عرصہ سے ٹریڈ یونین کے نمائندوں اور وزیر اعظم کے مابین گفت و شنید ہو رہی تھی جس کا مقصد

صرف یہ تھا کہ ابتدائے جنگ میں حکومت نے جو وعدے مزدور لیڈروں سے کئے تھے اُن سے وہ آزاد

ہو جائے۔ قومی نقطہ نگاہ سے یہ سچ ضروری ہے تاکہ وہ اپنی فوجی طاقت بڑھاسکے اور مغربی محاذ جنگ پر فوجیں روانہ کی جاسکیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ حکومت برطانیہ فوراً اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کر دے۔ وزیر اعظم نے اعلان کر دیا ہے اور یہ اعلان مزدوروں نیز پارلیمنٹ کی مخالفت پارٹی سے مشورہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا۔ (جلد سوم صفحہ ۳۴۹)

تار کے اختتامی الفاظ یہ ہیں:-

”وزیر اعظم کو اعتماد ہے کہ اس طرح کا بیان صدر کی اُن سابقہ تقریروں کے طرز پر ہوگا جن کا انگلستان اور دوسرے ممالک کی رائے عامہ نے پر زور استقبال کیا ہے“

مگر ولسن کو اس پیغام کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ تو پہلے ہی اپنے چودہ نکات کے سلسلہ میں ایک تقریر کرنے کا قصد کر چکا تھا۔

مسٹر لائڈ جارج نے، ولسن کی تقریر کے بعد ۱۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو پھر مزدور نمائندوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ:-

”لڑائی جیتنے یا کسی بڑے شہنشاہی مقصد کے حصول کا یہاں سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میں نے پندرہ دن قبل اپنے مقصد جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ یہی مطالبہ صدر امریکہ کا بھی ہے۔ ہم تو صرف اُس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو بیک وقت حکومت امریکہ ٹریڈ یونین کانگریس اور ہماری حکومت کا مقصد ہے“

آپ نے دیکھا کہ مزدور جماعت صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کونسا مقصد ہے جس کے لئے اُن کو جنگ کی آگ میں جھونکا جا رہا ہے اور حکومت نے کس طرح اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔

(باقی)

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۳۴۲ صفحات پر۔ قیمت معہ محصول ۱۳/۱۱
منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

بندہ نواز، گرامی نامہ کا شکریہ۔ جو گفتگو آپ نے چھیڑی ہے، اس میں شک نہیں بہت دلچسپ ہے، بشرط
اُنکہ آپ کی طرح کسی کو فراغ حاصل ہو اور اس سے لطف اٹھانے کی توفیق بھی۔
میری حالت تو اس دنیا میں ایسی ہے جیسے کسی امیر کے دسترخوان پر ضعفِ معدہ کا مریض! کہ سامنے سب کچھ ہے اور
پھر کچھ نہیں۔ اکبر مرحوم کا شعر ہے:-

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق
وہ کیا ہو اک جھلک ہو ہم کیا ہیں، اک نظر ہیں

مگر میرا نظریہ، کائنات کے متعلق کچھ اور ہے۔ آپ کہیں گے کہ پھر شاعری شروع کر دی، لیکن آپ نے بحث ہی ایسی چھیڑ دی
ہے کہ سوائے شاعری کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔

غالب کہتا ہے:-
”اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ“۔ بیدل اپنی زندگی کا سامان
یوں پیدا کرنا چاہتے ہیں:-
خونے پہ جگر جمع کن و رنگ بروں آ۔
میں بالکل بخیرانہ گزر جانے کا تایل
ہوں، لیکن ”متوکلانہ“ نہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا، کیا لذت رکھتا ہے۔

تادل بد نیا دادہ ام در کشمکش افتادہ ام
اندوہ فرصت یک طرف، ذوق تماشا یک طرف

یقیناً بعض اوقات مجھے بھی اس گھڑی کا خیال آجاتا ہے، جب ولولہ کے ساتھ احساس میں بھی ختم ہو جائے گا، لیکن مستقبل
کو ”حال“ تک کھینچ لانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ زمانہ اور زمانہ کی تباہ کاریاں اپنے اختیار میں نہیں، اُنکو بھلا دینا بیشک ایک
حد تک اختیار میں ہے۔ زندگی سے گزر جانا اتنی بڑی بات نہیں جتنا زندگی گزار دینا۔ آپ آسان بات کو سوچ رہے ہیں
اور میں اُس کو جو آسان نہیں۔

بہر حال، اور کچھ کام نہ ہو تو آپ کی طرح بیٹھ بیٹھ یہ سوچتے رہنا کہ کل کیا ہو گا ہے مزہ کی چیز، لیکن جو آج کی اُجھنوں
میں گرفتار ہے اُسے اس بھلاوے میں نہ ڈالے ورنہ وہ کچھ نہ کر سکے گا۔

ہماری سوگواری اور اندوہنا کی کا بڑا تعلق یہاں کی حکومت سے بھی ہے کہ ہاتھ پاؤں جلنے کی حالت میں بھی وہ
بقا حیات کی ذمہ دار نہیں، ضعف و درماندگی کے زمانہ کا کیا ذکر ہے۔ آپ لوگ سرمایہ دار ہیں آپ کی سمجھ میں یہ بات مشکل
ہے آئے گی، میں مزدور ہوں اور سوائے اس کے میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اس بحث لطیف میں یہ مکروہ عنقریب آپ کو پسند نہ آئے گا، لیکن مجھے آپ کا یہ ”چبا چبا کے باتیں کرنا“ کب پسند آتا ہے۔ میں آپ کی سنتا ہوں تو آپ بھی میری سنتے۔ ایک غریب کی تسکین کے لئے یہ بھی کم نہیں اسے تو مجموعہ خوبی بہ چہ نامت خواہم !

پورے دو دن یہ سوچتے ہوئے گزر گئے ہیں کہ آپ کے خط کا جواب لکھوں لیکن باور کیجئے کہ ہمت نہ ہوئی، جب حضوری تھی تب بھی دل ہر وقت کانپتا رہتا تھا، اور اب کہ حضوری نہیں، وہی حال ہے۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا شہد ہے کہ آپ مجھ سے جس قدر دور ہیں، اتنا ہی مجھ سے قریب ہیں۔ اس قدر قریب کہ ”نتواں ترا و جان را ہم امتیاز کردن“ ! آپ نے جس محبت سے یاد فرمایا ہے اس کا اقتضاء صرف یہ تھا کہ میں خود حاضر ہو کر ”خراج نیایش“ پیش کرتا، لیکن افسوس ہے کہ اس کی اجازت نہیں، اور ہو بھی تو مصلحت نہیں، اس لئے آپ ہی بتائیے کہ جو باتیں صرف نگاہوں سے کرنے کی ہیں انہیں الفاظ سے کیوں کر ادا کروں !

آپ کی نئی زندگی سے مجھے دلچسپی تو نہ ہونا چاہئے، لیکن اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی باقی رہی تو مجھے افسوس ہوگا میرے لئے تو زندگی کے تجربوں میں اب تلخ و شیریں کا امتیاز باقی نہیں رہا، لیکن خدا نخواستہ اگر آپ کو کسی وقت اس پر غور کرنا پڑے تو مجھے سنت تکلیف ہوگی۔

اگر اجازت ہو تو ایک درخواست پیش کروں۔ اور وہ یہ ہو کہ جہان تنگ ممکن ہو، مجھے یہ سمجھنے کا موقعہ دیجئے کہ آپ مجھے بھلا دیا ہے۔ مجھے زندہ رہنے کا شوق تو نہیں ہے لیکن ضرورت یقینی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہو جب ماضی کی تلخ کامیاں مجھے یاد نہ آئیں۔ آپ کے ساتھ میرے ماضی کا تعلق اتنا شدید ہے کہ میں آپ کو ”اپنا گزرا ہوا زمانہ“ کہتا ہوں، اس لئے آپ کیوں میرے حال میں اس نوش کو شامل کریں، جس کے تحمل کا حوصلہ اب مجھ میں نہیں۔ لیکن اگر آپ نے یہی فیصلہ کر لیا ہو کہ بہر صورت مجھے مرجانا ہی چاہئے، تو بسم اللہ! رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو !

اللہ اللہ، کیا تیر ہیں، ذرا دیکھئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے چھوٹے ہوئے گزر جائیں اور میرے دامن میں لگ جائیں کیوں دیوانے ہوئے ہو۔ وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا ! میں قیامت تک تمہارے کہنے میں نہ آؤں گا۔ جانتا ہوں کہ تم سے کوئی معاملہ کرنا دل کا خون کرنا ہے۔ اور اب یہاں اس کی تاب نہیں۔

میں یوں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں، لیکن تمہارے عہد و پیمان کی تائید مجھ سے ممکن نہیں۔ اگر تمہاری کامیابی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ میں تمہاری ”قول و قرار“ کا ضامن بن جاؤں، تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں تمہاری کامیابی کا ساتھی نہیں۔

باب الاستفسار کیا آپ مسلم ہیں؟

(جناب محمد صفی اللہ صاحب - بارکپور)

میں آپ سے ایک نہایت مختصر سوال کرنا چاہتا ہوں اور مختصر ہی اس کا جواب چاہتا ہوں یعنی یہ کہ آپ کیا واقعی مسلم ہیں، اگر ہیں تو پھر اسکے معنی یہ ہوئے کہ ساری دنیا کے تمام مسلمان، مسلمان نہیں ہیں اور اگر آپ مسلم نہیں ہیں تو پھر اسکا اعلان کیوں نہیں کرتے۔

(نگار) میں واقعی مسلمان ہوں، اور اگر میرے مسلمان رہنے سے ساری دنیا دائرہ اسلام سے خارج ہوئی جاتی ہے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔ لیکن یہ خدشہ آپ کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ اسلام ایسی جنس کیسا ہے کہ وہ سوائے میرے کہیں اور دستیاب ہی نہیں ہو سکتی۔ آپ میری "نامسلمانی" کا مرتبہ اتنا بڑھائیے کہ مجھے خود اس سے حجاب آنے لگے۔ معاف فرمائیے آپ نے جس زاویہ نگاہ سے یہ سوال کیا ہے وہ درست نہیں اور اس لئے آپ کی خواہش کے مطابق بہت زیادہ مختصر جواب سے آپ کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

آپ کو میرے اسلام کی طرف سے صرف اس لئے شبہ ہے کہ میرے عقاید، عام عقاید سے علاوہ ہیں، لیکن عام عقاید کا اختلاف ایک شخص کو اس جماعت یا قوم سے علیحدہ نہیں کر سکتا جس میں اس کا نشوونما ہوا ہے۔ اس لئے جب تک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں، دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ مجھے ملت اسلامی کے دائرہ سے خارج کر دے، خواہ میرے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

حیرت ہے کہ میں تو ایک حور و تصور پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان کو بھی باوجود اس مادیت پرستی کے مسلمان سمجھوں اور وہ میرے اسلام میں جو یکسر اخلاق و روحانیت ہے شبہ کرے۔

اب اس قسم کی طفلانہ باتوں کا زمانہ نہیں رہا ہے، کچھ کام کی باتیں کیجئے۔ میں اگر تعلیمات اسلام کو کسی ایسے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں جو آپ کے نقطہ نظر سے مختلف ہے، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم آپ علیحدہ ہیں۔

حسنگ واحد و عیار اتنا ششٹی

رہ گیا کفر و اسلام، سواب یہ اصطلاحیں بالکل بے معنی ہیں اور صرف مولویوں اور پنڈتوں کے روٹی کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ آپ اس جھگڑے میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کیجئے اور نہ مجھے کافر سمجھ کر اپنی عاقبت خراب کیجئے۔

مُجز سخن کفرے و ایمانے کجاست

خود سخن در کفر و ایمان می رود !

تنوعات

گزشتہ تین ہزار سال میں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ جانین زلزلہ کی نذر ہوئی ہیں ————— دنیا میں دودھ پلانے والی مخلوق ۱۳ ہزار قسم کی ہے۔ چڑیوں کی قسمیں ۲۲ ہزار ہیں اور حشرات کی سات ہزار ————— کوئے دن بھر میں کم از کم ۲۵ مرتبہ پانی پیتے ہیں ————— اگر دو سوانح والی نئی دورین کے ذریعہ سے جو حال ہی میں طیارہ ہوئی ہے، ایک میل کے فاصلہ پر کسی کبھی کو دیکھا جائے تو اس کی آنکھیں تک نظر آئیں گی ————— امریکن ہوٹلوں کے کاروبار میں پانچ لاکھ پچاس ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں جو سالانہ ۲۰ کروڑ آدمیوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں ————— سنگھائی میں روزانہ اخبارات بجائے فروخت کرنے کے زیادہ تر کرایہ پردے جاتے ہیں اور ایک ہی کاپی متعدد آدمیوں کو دیکر ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ کرایہ وصول کیا جاتا ہے ————— لندن میں ہر مربع میل پر سالانہ ۲۴۰ ٹن کا جل گرتا ہے ————— کوچین چائنا میں طلاق دینا بہت آسان ہے، چار آدمیوں کو جمع کر کے چاول کھانے کی تیاریوں کو توڑ دیا اور طلاق ہو گئی ————— ہیرا تو لٹنے کے کانٹے اس قدر نازک و صحیح ہوتے ہیں کہ پلک کا ایک بال بھی اس کے توازن کو متاثر کر سکتا ہے ————— امریکہ میں اس وقت تین کروڑ انسان ایسے بچتے ہیں جو نسل کے لحاظ سے جرمن ہیں ————— دنیا کے تمام سمندر..... ۴۴۵ مربع میل زمین گھیرے ہیں۔ گویا کرۂ ارض کے ۷۵ فی صدی حصہ پر پانی کی حکومت ہے ————— یہ نیپولین کی ایجاد تھی کہ مکانوں پر نمبر ڈالتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے کہ ایک طرف طاق نمبر پڑیں اور دوسری طرف جفت۔ ————— فرانس کی اکاڈمی کا بیان ہے کہ یورپ میں ۶۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ساری دنیا میں ۲۷۹۶ ————— اوسط وزن سر کے بالوں کا چھ اونس ہوتا ہے۔ بال کا نشوونما ہر مہینے آدھ انچ ہے اور اس کا قطر انچ کا پچیسواں حصہ ————— نوزائیدہ بچے صرف دو باتوں کا خوف لیکر دنیا میں آتے ہیں ایک گرنے کا خوف دوسرا بلند آواز کا، باقی جتنے خوف ہیں وہ اکتسابی ہیں ————— ہر مرتبہ جب گلاس میں پانی پیایا جاتا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ تپلا ہو جاتا ہے ————— اگر بارش اس پانی کو واپس نہ دے جو سمندر سے حاصل کرتی ہے تو تمام سمندر تین ہزار سال میں خشک ہو جائیں۔

یاد

(ایک انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ)

میں ہوں فسرده اک کلی گزری ہوئی بہار کی *I am the blossom of a bygone spring*
 جد دل دلفریب ہوں صفحہ روزگار کی *Pressed in the books of Time, a lovely thing*
 درد بھری اک آہ ہوں قلب امیدوار کی *The hunger of an unfulfilled desire*
 خاک ہوں میں جلی ہوئی عشق کے شعلہ زار کی *The ashes in the hearth of last year's fire.*
 (یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

مرہم زخم ہائے دل چارہ درد زندگی، *I am the balm that softens all life's*
 غم بھی نصیب غم بھی ہوں راز بلند و پست بھی *The heights, the depths, the anguish & scars*
 جمع ہے میرے سائے میں دور کہن کی ہر گھڑی *Into my cooling dark your minutes the stars*
 میں ہی تو سجدہ گاہ ہوں ماضی ناگزشتہ کی *I am the temple of the living past.*
 (یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

میں ہی تنہی خوشی کے دن میں ہی گھڑی لال کی *I am the days you joyed, the days you wept,*
 میرا ہی طاق بخودی قبر ہے ہر خیال کی *In my vast vault of silence safely kept*
 خندہ شاد کام ہوں آہ شکستہ حال کی *I am your laughter, I your sobbing cry*
 میں ہوں صدائے بازگشت نغمہ لازوال کی *The Echo of a voice that can not die*
 (یاد بھی ہے میں کون ہوں؟)

حلقہ زلف شب ہوں میں سلسلہ سحر بھی میں *I am the link that bridges Night &*
 میں ہوں وجود کائنات موت سے بخیر بھی میں *I am the soul that lives when all is gone*
 میرا ہی نام "کل" بھی ہے "آج" کا مستقبل بھی میں *The yesterday, when this today shall be*
 زیست بھی میں فنا بھی میں خلد بھی میں سقر بھی میں *I am your life, your death, your hell*
 یعنی میں اُس کی یاد ہوں *I am memory.*
 فانی بدایونی

آدم گھنٹہ

ایک مل میں

الہی کس چیز کا تجسس مجھے یہ عالم دکھا رہا ہو
 خلاف معمول تنہی تیزی ہو آج دل کیوں دھڑک رہا ہو
 زمیں پر سو سج کی روشنی کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہو
 جو تنگ دروازہ ہو کسی جاتو اس پر کمرچ پڑی ہوئی ہو
 ہر ایک کی شے میں ہو کثافت ہر ایک کے نے میں صحت پھڑپھڑے ہیں
 برکیٹوں پر کسے ہوئے موٹروں کو بجلی چلا رہی ہو
 نظر کی حد تک لگی ہوئی ہیں بڑے سے اک بال میں مشینیں
 قدم قدم پر ہلاکتوں کا مہیب سامان ہو مہیا
 وہ شور پیدا ہو انجنوں سے کہ بام و درتھر تھر رہے ہیں
 تمام منظر کیفیت چھا رہی ہو کچھ اختلاج کی سی

یکن حجابوں میں چھپ کے شیطان گیت اپنا سنار رہا ہو
 رگوں میں ہو ارتعاش پیدا دماغ ماؤں ہو چلا ہو
 فضا میں تازہ ہوا کا اک سانس کیلئے بھی گزر نہیں ہو
 اور اسکی تہ میں ہلاکتوں کی تباہ کاری چھپی ہوئی ہو
 غلیظ چکیٹ سودائیں بائیں نقوش حسرت چھپے ہوئیں
 اُدھر سے اک بال آ رہی ہو اُدھر سے اک بال جا رہی ہو
 ہیں دو ہیں دائیں بائیں پیٹھ پر سر کے اوپر شاؤٹ مینیں
 جگہ جگہ سرخ تختیوں پر نظر کے آگے ہو لفظ "خطرہ"
 زمین پیہم لرز رہی ہو، فضا میں رعشے سے چھا رہی ہیں
 دماغ و دل میں ہو رنج پیدا بغاوت و احتجاج کی سی

غلام بنکر انھیں مشینوں کے ساتھ بیٹھا آدمی بھی،
 نہ جانے کیوں تیرگی میں اسکو سٹری ہوائیں ہوئیں گوارا
 ہیں ایک لوطے کے ڈھیر میں دو جہان اسکے لئے ہویدا
 مشین کا بن کے جزو اسکو نہ جانے کیوں ملگئی ہواحت
 وہ ایک مردود و دو جہاں ہو جو اپنی خود داریاں مٹا دے
 یہ غافل انسان موت میں بھی سمجھ رہا ہو فروغ ہستی
 جنوں کی قیمت پہنچا ہو یہ ذوق و شوق و کمال اپنا
 بنا ہو تہذیب کا پیمبر اور اس کو اتنی خبر نہیں ہے
 متاع انسانیت گنوائی ہو اسنے لوطے کے ٹھیکروں پر
 نہیں ہو اسکی اپج کو کوئی اب اسکے انجام سے تعلق
 خیالی جنت کے سامری نے اسے شکنجے میں کس لیا ہو
 کھڑا ہو ہو خموش و ساکت مشین کے دیوتا کے آگے

اثر یہاں سے نکل کے بھاگو یہ بزم انسانیت نہیں ہے

یہاں ہو شیطان کی حکومت خدا کی یہ مملکت نہیں ہے

فصل الدین اثر ایم۔ اے

غزل

حاصلِ عشق تھا وہ عہدِ تمنا اپنا
 مائلِ لطف ہے خود آج مسیحا اپنا
 رنج و راحت سے جدا تجھ سے میں کچھ چاہتا ہوں
 کھو دیالے ترے نیزنگِ کرم نے وہ بھی
 مقصدِ زیست کی تعیین میں حیراں ہو جہاں
 اُن کا وہ حال کہ جیسے کوئی دولت پالی
 غور سے دیکھ مجھے میرے مٹانے والے
 ہائے وہ دن کہ دوعالم سے تو کیسوی ہو کر
 ورنہ ہم اور غمِ ناشنوائی، توبہ
 وصل کے دھوکے میں کھو بیٹھے شکیبائی بھی
 کیا خبر تھی کہ غمِ عشق کا حاصل ہوگا
 پھر تو تمکینِ شب ہجر کا کٹنا معلوم
 زندہ رہنے ہی پہ ٹھہرا ہے جو مرنا اپنا

تمکین (سرست) حیدر آبادی

تقریباً ہر ماہ

آپ حضرات کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جاتی ہے کہ پچھلے پچھلے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ اسی ماہ کے
 اخیر تک دفتر میں آجانی چاہئے ورنہ ڈاکخانہ کے جدید قانون کے زیر اثر تمام پچھلے ماہ کے پیرے کے ٹکٹ لگا کر بھیجے پر مجبور نہ
 ہوں گے بعض حضرات نیزنگ طلب کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ آئندہ ایسے کسی خط کی تعمیل نہ ہوگی اگر لے کر کے ٹکٹ وصول کیا
 مینجر نگار